BUDC-134

اردو نظم کا مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینیٹیز

بلاک

3

چنندہ نظم گو شعرا کی نظم گوئی کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریحات-II

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 9
اسمٰعیل میرٹھی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 151

اکائی 10
پنڈت برج نراین چکبست کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 169

اکائی 11
علامہ اقبال کی نظم نگاری اور ان کی منتخب نظموں کی تشریحات 187

اکائی 12
جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات 217

بلاک 3 تعارف

کورس **BUDC-134** **اردو نظم کا مطالعہ** کے تیسرے بلاک کا عنوان **چنندہ نظم گو شعرا کی نظم گوئی کی خصوصیات اور منتخب نظموں کی تشریحات-II** ہے۔ یہ بلاک منتخب نظم نگاروں کی خصوصیات اور ان کی مخصوص نظموں کی تشریحات سے متعلق ہے اس میں بھی کل 4 اکائیاں ہیں۔ ان کی تفصیلات ذیل میں درج ہیں۔

اکائی 9: اسمٰعیل میرٹھی کی نظم نگاری کی خصوصیات، فن اور منتخب نظموں کی تشریحات ہیں۔

اکائی 10: برج نرائن چکبست کی نظم نگاری، ان کے عہد، فن اور مخصوص نظموں کی تشریحات ہیں۔

اکائی 11: علامہ اقبال کی نظم نگاری، ان کے عہد، فن اور ان کی شاعری کے مختلف ادوار کے ساتھ دو منتخب نظموں کا مطالعہ کریں گے۔

اکائی 12: جوش ملیح آبادی کی شاعری، عہد، فن، حیات اور منتخب نظموں سے واقفیت حاصل کریں گے۔

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 9 اسمٰعیل میرٹھی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 نظم گوئی کی تعریف

9.4 نظم نگاری کی ہیئتیں اور اقسام

9.5 اُردو نظم کا عہد بہ عہد ارتقا

9.6 منتخب نظموں کی تشریح

9.7 آپ نے کیا سیکھا

9.8 اپنا امتحان خود لیجیے

9.9 سوالات کے جوابات

9.10 فرہنگ

9.11 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- اسمٰعیل میرٹھی اور ان کی ادبی خدمات کی جانکاری حاصل کریں گے
- نظم، نظم گوئی کی تعریف، نظم گوئی کے موضوعات، ہیئتیں اور اقسام کا مطالعہ کریں گے
- اردو نظم نگاری کے عہد بہ عہد ارتقا کا مطالعہ کریں گے

9.2 تمہید

اسمٰعیل میرٹھی کا شمار اردو کے اہم اور مقبول نظم نگار شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ 12 رنومبر 1844 میں میرٹھ میں پیدا ہوئے اور 1917 میں انتقال کیا۔ ان کا اصل نام محمد اسمٰعیل اور تخلص اسمٰعیل میرٹھی تھا۔ اپنے عہد کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر ہی حاصل کی پھر فارسی اور انگریزی

میں مہارت حاصل کر کے انجینئرنگ کا کورس پاس کیا۔ بچوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی کے سبب انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کر کے بچوں کے لیے نظمیں لکھنا شروع کیں اور ان کے لیے نصابی کتابیں بھی مرتب کیں۔ انھوں نے بچوں کی پسند، نفسیات اور دلچسپی کے پیشِ نظر روزمرہ زندگی کے موضوعات پر سادہ، بامحاورہ اور آسان زبان میں بے شمار نظمیں لکھیں۔ بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے اور نظم نگاری کی ہیئت سے متعلق بعض فنی تجربے بھی کیے۔ ان کی نظموں کے موضوعات اخلاقی، اصلاحی اور دلچسپ ہیں جو ہمارے آس پاس کی زندگی اور ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے بچوں کی معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں کی اہمیت وافادیت جس طرح ہر عہد میں برقرار رہی ہے آج بھی انھیں اسی شوق اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی کا کلام 'کلیات اسماعیل میرٹھی' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ 'آبِ زلال'، 'ہماری گائے'، 'اچھا زمانہ آنے والا ہے'، 'کیے جاؤ کوشش'، 'تاروں بھری رات'، 'ملمع کی انگوٹھی'، 'پن چکی'، 'برسات'، 'گرمی کا موسم' وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں، جن میں سماجی، اخلاقی، انسانی اقدار، مناظر قدرت، ماحولیات، حب الوطنی، انسان دوستی، درختوں، جانوروں سے لگاؤ، بھائی چارہ، عمل، یقین اور اُمید وحوصلہ مندی کی ایسی خصوصیات موجود ہیں جو ملک وقوم کے بچوں اور نوجوانوں کو نیک سیرت، باعمل اور باکردار انسان بنانے میں مددگار ثابت ہوتی رہی ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی نے بیشتر نظمیں قوم کے بچوں کی اصلاح اور ان کی نصابی یا تعلیمی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر تخلیق کی ہیں۔

9.3 نظم گوئی کی تعریف

نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ''لڑی میں موتی پرونا'' ہیں۔ لفظ نظم کو انتظام، ترتیب، آرائش کے معنی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر ادب کی دو قسمیں ہیں (1) نثری ادب (2) شعری ادب۔ ادبی اصطلاح کے طور پر ''نظم'' کا لفظ دو طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ (1) یہ لفظ نثر کی ضد کے طور پر بولا جاتا ہے۔ یعنی ہر وہ کلام جو نثر نہ ہو اسے نظم کہا جاتا ہے۔ (2) نظم کا دوسرا مفہوم شاعری کی اس صنف کے لیے مخصوص ہے جس میں کسی خاص موضوع پر ترتیب وتسلسل کے ساتھ شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

موضوع کے اعتبار سے نظم کی خوبی یا پہچان یہ ہے کہ اس کا ایک خاص مرکزی خیال ہوتا ہے پوری نظم میں اسی مرکزی خیال سے متعلق تفصیلات کو پیش کیا جاتا ہے۔ موضوع کے تسلسل اور مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ نظم کا پھیلاؤ یا وسعت بھی اس کی اہم خصوصیت ہے۔ نظم میں وحدت تاثر، تسلسل بیان اور موضوع کا تدریجی ارتقا ضروری ہے۔ نظم کا دامن غزل کے مقابلے میں خاصا وسیع ہے جس میں ہر

قسم کے موضوعات کو تسلسل اور تفصیل کے ساتھ منظوم کیا جا سکتا ہے۔

9.4 نظم نگاری کی ہیئتیں اور اقسام

اردو کی نظمیہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ عام طور پر پوری اردو شاعری کو نثر کی ضد کے بطور ''نظم'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، گیت، دوہا وغیرہ تمام شعری اصناف اس کے دائرے میں آجاتی ہیں۔

اردو نظم کی کئی اقسام ہیں۔ مخصوص شعری ہیئت کی حامل وہ کلاسیکی شعری اصناف جو کہ عربی، فارسی سے اردو میں آئی ہیں ان میں قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ شامل ہیں۔

وہ شعری ہیئتیں جنھیں با قاعدہ صنفِ سخن کا درجہ حاصل نہیں ہے لیکن جو اپنی مخصوص ہیئت سے پہچانی جاتی ہیں، ان میں مسمط، مثلث، مربع، مخمس، مسدّس، مسبع، مثمن، متسع، معشر، ترجیع بند، ترکیب بند، اور مستزاد وغیرہ اہم ہیں۔ شہر آشوب، ریختی اور نظمانے خالص اردو شعری اصناف ہیں۔ جب کہ دوہا، گیت، بارہ ماسہ وغیرہ ہندی ادب کی دین ہیں۔ جس طرح پنجابی سے 'ماہیے'، فرانسیسی ادب سے 'ترائیلے' اردو میں رائج ہو گئے ہیں اسی طرح 'ہائیکو'، 'تنکا'، 'رینگا'، 'سیڈوکا'، 'چوکا' اور 'سین ریو' وغیرہ جاپانی ادب سے اردو شاعری میں داخل ہوئے ہیں۔

صنف سخن کے لحاظ سے نظم کی اصطلاح ایک جدید تصور کی حامل ہے۔ اسی لیے اُسے ابتداً جدید شاعری اور پھر نظمِ جدید سے موسوم کیا گیا۔

موجودہ عہد میں ہیئت کے اعتبار سے صنف 'نظم' کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں:

(1) **پابند نظم:** جس میں مخصوص بحر کے استعمال کے ساتھ مقررہ اُصولوں کی پابندی کی جاتی ہے پابند نظم کہلاتی ہے۔ مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، گیت وغیرہ تمام پابند نظم کے زمرے میں شمار کی جاتی ہیں۔

(2) **نظم معرّا:** ایسی نظم کو کہتے ہیں جس کے تمام مصرعے وزن کے اعتبار سے برابر ہوتے ہیں لیکن قافیہ نہیں ہوتا۔

(3) **آزاد نظم:** یہ ایسی نظم ہے جس میں نہ تو قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے اور نہ ہی بحر کے استعمال میں مروّجہ شعری اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جس کے مصرعے چھوٹے، بڑے ہو سکتے ہیں، 'آزاد نظم' کہلاتی ہے۔ انگریزی میں آزاد نظم کے لیے Free vesse کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو ادب میں آزاد نظم کا آغاز انگریزی نظم سے متاثر ہو کر ہوا ہے۔ اردو میں معرّا اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم کا رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو نظم نے موضوعاتی تنوّع کے ساتھ مختلف ہیئتوں اور تسلسل و تفکر کے ارتکازی اوصاف کے سبب معنوی وسعت کی حامل ایک اہم صنفِ سخن کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

بعض ہیئتوں کو مخصوص حالات اور تقاضوں کے سبب مقبول صنف سخن کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

9.5 اُردو نظم کا عہد بہ عہد ارتقا

اُردو میں ابتدا ہی سے کلاسیکی نظمیہ شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے کلیات میں مختلف موضوعات پر مختلف شعری ہیئتوں اور اصناف میں متعدد نظمیں شامل ہیں۔ ابتداً جن اردو شعرا نے غزل کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، رباعیات، قطعات وغیرہ شعری اصناف اور مروّجہ ہیئتوں میں نظمیہ شاعری کی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں ان میں ملا وجہی، نشاطی، غواصی، نظامی، نصرتی، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا محمد رفیع سودا، محسن کاکوروی، میر حسن، دیا شنکر نسیم، انیس، دبیر، شوق قدوائی، امانت لکھنوی، ذوق، مومن، غالب، محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر الٰہ آبادی، برج نرائن چکبست، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، عبدالحلیم شرر، تاجور نجیب آبادی، فراق گورکھپوری، روش صدیقی، نظم طباطبائی، سیماب اکبر آبادی، عبدالرحمٰن بجنوری، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، جمیل مظہری، عظمت اللہ خاں، ظفر علی خاں، افسر میرٹھی، پنڈت دتاتریہ کیفی، وحیدالدین سلیم، احسان دانش، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، وامق جونپوری، اختر الایمان، ن.م. راشد، میراجی، عمیق حنفی، قاضی سلیم، سکندر علی وجد، شہریار، بلراج کومل، تصدق حسین خالد، شاد عارفی، مختار صدیقی، مجید امجد، محمد علوی، عادل منصوری، شمس الرحمٰن فاروقی، کمار پاشی، زبیر رضوی، شفیق فاطمہ شعریٰ، منیر نیازی، نریش کمار شاد، ستیہ پال آنند، ندا فاضلی، جمیل الدین عالی وغیرہ کا شمار اردو کے اہم اور نمائندہ نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی اردو کے پہلے اہم نظم نگار شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات کو مختلف ہیئتوں میں اپنی نظموں میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے مغربی اثرات سے متاثر ہو کر موضوعاتی نظمیں تخلیق کر کے اردو نظم کو فطرت کی منظر کشی اور اخلاقی، اصلاحی مقصد کی خاطر استعمال کیا۔ ان کی کوششوں سے اردو

میں جدید شاعری یا باقاعدہ نظمیہ شاعری کا آغاز ہوا۔ مشاعروں کے لیے بھی موضوعاتی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ اس طرح نظم جدید ملک کے تبدیل شدہ حالات سماجی معاملات و مسائل کی ترجمان بن گئی۔ حالی اور آزاد کی اس نئی اور مفید شعری روایت کو آگے بڑھانے میں شبلی نعمانی، اسمٰعیل میرٹھی، اکبرالہ آبادی اور چکبست لکھنوی وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ شبلی نے سیاسی اور تاریخی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔

اسمٰعیل میرٹھی نے قوم کے نونہالوں کی دلچسپی کو پیشِ نظر رکھ کر روزمرہ زندگی کے موضوعات کو عنوان بنا کر آسان اور سادہ مگر پُر اثر انداز میں نظمیں لکھ کر اپنی علاحدہ پہچان قائم کی۔ اکبرالہ آبادی نے زوال پذیر معاشرے کی اصلاح کی خاطر طنزیہ اسلوب اختیار کر کے کئی اہم نظمیں کہیں۔ چکبست نے حب الوطنی کو فروغ دینے کی غرض سے قومی، انقلابی اور اصلاحی نظمیں لکھ کر اپنی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا۔

عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی اور اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے اردو نظم نگاری میں بعض ہیئتی تجربے کر کے اردو نظم کو تازگی، تنوع اور معنویت اور جدت سے روشناس کرایا۔ ان لوگوں نے اپنی کوششوں سے اردو شاعری میں نظم آزاد، نظم معرّا کے قابل قدر نمونے پیش کر کے اردو کی نظمیہ شاعری کے کینوس کو وسیع تر بنا دیا۔ سانیٹ، نثری نظم کے علاوہ فرانسیسی اور جاپانی کی بعض شعری ہیئتوں سے متاثر ہو کر ترائیلے اور ہائیکو جیسی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں۔ عبدالحلیم شرر، اسمٰعیل میرٹھی، ن.م.راشد، تصدق حسین خالد، میراجی، یوسف ظفر، مخمور جالندھری، ضیا جالندھری، وغیرہ نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر اردو کی نظمیہ شاعری کو ایک نیا اعتبار اور وقار عطا کیا۔

اسمٰعیل میرٹھی اور پنڈت دتاتریہ کیفی نے اردو میں نئی روش اختیار کر کے غیر مقفیٰ نظمیں لکھیں۔ نظم طباطبائی اور دتاتریہ کیفی نے اردو نظم نگاری میں اسٹینزا فارم کی ابتدا کی۔ اردو میں انگریزی کے معروف شعرا کی نظموں کو اردو کے جن شعرا نے منظوم کیا ان میں علامہ اقبال اور نظم طباطبائی کے علاوہ ظفر علی خاں، عبدالرحمٰن بجنوری، غلام بھیک نیرنگ، عزیز لکھنوی، پیارے لال شاکر، اختر جونا گڑھی، قیصر بھوپالی، طالب بنارسی، ارشد صدیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

علامہ اقبال بنیادی طور پر نظم گو شاعر تھے۔ انھوں نے مختلف شعری ہیئتوں میں مختلف نئے موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو کی نظمیہ شاعری کو فکر و فلسفہ، مقصدیت اور معنویت سے ہم آہنگ کر کے اردو شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ جوش نے اپنی نظموں میں انقلابی آہنگ پیدا کیا۔ ترقی پسند نظم نگار شعرا میں فیض، سردار جعفری، مخدوم، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی وغیرہ نے سماجی، سیاسی اور قومی مسائل کو کامیابی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا۔ اختر الایمان نے خالص نظم گو شاعر کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ سجاد ظہیر، محمد حسن وغیرہ نے نثری نظمیں لکھ کر اردو

میں ایک نئے انداز و آہنگ کا آغاز کیا۔

ہیئت و اسلوب کے سلسلے میں تجربہ کرنے والے نظم گو شعرا میں ایک اہم نام عظمت اللہ خاں کا بھی ہے۔ انھوں نے ہندی کے سبک الفاظ، علامات اور بحریں استعمال کر کے اردو کی نظمیہ شاعری کو انفرادیت عطا کی۔

جدیدیت کے رجحان کے زیرِ اثر نظمیں لکھنے والے نظم نگار شعرا میں شمس الرحمٰن فاروقی، قاضی سلیم، عمیق حنفی، شہریار، عادل منصوری، زبیر رضوی، کمار پاشی، وغیرہ کے نام بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔

اردو نظم نگاری کے عہد بہ عہد ارتقا کے اس مختصر جائزے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ از ابتدا تا حال اُردو کی نظمیہ شاعری نے شاندار سفر طے کرتے ہوئے وقت اور حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ضروری فنی تجربے کرتے ہوئے نئے موضوعات کو پیش کر کے اردو نظم کے دامن کو اس قدر وسیع تر اور معتبر بنا دیا ہے کہ اسے دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی نظمیہ شاعری کے سامنے فخریہ طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

9.6 اسمٰعیل میرٹھی کی منتخب نظموں کی تشریح

اسمٰعیل میرٹھی، اردو کے اہم نظم نگار شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے دوسری شعری اصناف کے مقابلے میں نظم نگاری میں طبع آزمائی کرنا اس لیے مناسب سمجھا کہ وہ شاعری خصوصاً نظم گوئی کو ایک خاص مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے عہد کے حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ اس لیے انھوں نے شاعری کو عشقیہ جذبات کے اظہار یا تفنن طبع کا وسیلہ نہیں سمجھا۔ وہ اس کے ذریعے تعمیری، اصلاحی، کام لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے شاعری خصوصاً نظم گوئی کو مقصدی بنانے اور اس میں معنویت پیدا کرنے کی غرض سے اپنے عہد کے حالات کے مطابق موضوعات و مسائل پر متعدد نظمیں، سادہ، آسان زبان میں لکھ کر اپنی ایک خاص پہچان بنائی۔ انھوں نے اردو شاعری میں موضوعاتی تنوع بھی پیدا کیا اور بعض اہم فنی تجربے بھی کیے۔ انھوں نے بڑوں کے لیے بھی شاعری کی لیکن ان کی شاعری کا بیشتر حصّہ بچوں کے لیے ہے۔ وہ قوم کے نونہالوں کی ذہنی، فکری، علمی اور نفسیاتی تربیت کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ خود ایک اچھے اور کامیاب معلّم تھے اس لیے بچوں کے مزاج، پسند، نفسیات اور ان کی دلچسپی سے بخوبی واقف تھے۔

اسمٰعیل میرٹھی نے ہر عمر کے بچوں کے لیے نظمیں لکھی ہیں۔ خاص مقصدیت، معنویت، اثر انگیزی اور افادیت کے سبب یہاں ان کی دو خاص مشہور نظمیں (1) ''آبِ زلال'' اور (2) اچھا زمانہ آنے والا ہے مع تشریح کے پیش کی جارہی ہیں۔ جن کے مطالعے سے اسمٰعیل میرٹھی کی علمیت، بصیرت، لسانی اور شعری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

I آبِ زلال

خدا نے دی ہے تم کو عقل و تمیز ذرا دیکھو تو یہ پانی ہے کیا چیز
دکھاؤ کچھ طبیعت کی روانی جو دانا ہو تو سمجھو کیا ہے پانی
یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے گرہ کھل جائے تو فوراً ہوا ہے
نظر ڈھونڈے مگر کچھ بھی نہ پائے زباں چکھے مزہ ہرگز نہ آئے
ہواؤں میں لگایا خوب پھندا انوکھا ہے تری قدرت کا دھندا
نہیں مشکل اگر تیری رضا ہو ہوا پانی ہو اور پانی ہوا ہو
مزاج اُس کو دیا ہے نرم کیسا جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا
نہیں کرتا جگہ کی کچھ شکایت طبیعت میں رسائی ہے نہایت
نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ ہر اِک سانچے میں ڈھل جاتا ہے جھٹ پٹ
نہ ہو صدمے سے ہرگز ریزہ ریزہ نہ ہو زخمی اگر لگ جائے نیزہ
نہ اُس کو تیر سے تلوار سے خوف نہ اُس کو توپ کی بھرمار سے خوف
تواضع سے سدا پستی میں بہنا جفا سہنا مگر ہموار رہنا
نہیں ہے سرکشی سے کچھ سروکار نہ دیکھو گے کبھی تم اُس کا انبار
خزانہ گر بلندی پر نہ ہوتا تو فوارے سے وہ باہر نہ ہوتا
جو ہلکا ہو اُسے سر پر اُٹھائے جو بھاری ہو اُسے غوطہ کھلائے
نہ جلتا ہے نہ گلتا ہے نہ سڑتا نرا پانی نہیں ہرگز بگڑتا
اسے بھینچو دباؤ یا ٹٹولو اسے چھیڑو اچھالو یا گھنگولو
اسے رگڑو گھسو پیسو بہاؤ جھکولے دو مسل ڈالو دباؤ
کسی عنوان سے ہوگا نہ نابود وہی پانی کا پانی دودھ کا دودھ
لگے گرمی تو اُڑ جائے ہوا پر پڑے سردی تو بن جاتا ہے پتھر
ہوا میں مل کے غائب ہو نظر سے کبھی اوپر سے بادل بن کے برسے
ہوا پر چڑھ کے پہنچے سیکڑوں کوس کبھی اولا کبھی پالا کبھی اوس
کہر ہے بھاپ ہے پانی ہے یا برف کئی صیغوں میں ہے ایک اصل کی صَرف
اُسی کے دم سے دنیا میں تری ہے اُسی کی چاہ سے کھیتی ہری ہے
پھلوں میں پھول میں ہر پنکھڑی میں ہر اِک ٹہنی میں ہر بوٹی جڑی میں
ہر اِک ریشہ میں ہے اُس کی رسائی غذا ہے جڑ سے کونپل تک چڑھائی
پھلوں کا ہے اُسی سے تازہ چہرہ اُسی کے سر پہ ہے پھولوں کا سہرا
اُسی کو پی کے جیتے ہیں سب انساں اُسی سے تازہ دم ہیں سارے حیواں

یہی معدے کو پہنچاتا رسد ہے — یہی تخلیق میں کرتا مدد ہے
عمارت کا بسایا اُس نے کھیڑا — تجارت کا کیا ہے پار بیڑا
زراعت اس کی موروثی اسامی — صناعت کے بھی اوزاروں کا حامی
کہیں ساگر کہیں کھاڑی کہیں جھیل — کہیں جمنا کہیں گنگا کہیں نیل

یہی پہلے زمیں پر موجزن تھا — نہ میداں تھا نہ پربت تھا نہ بن تھا
زمیں سب غرق تھی پانی کے اندر — جدھر دیکھو سمندر ہی سمندر
زمیں پوشیدہ تھی اُس کی بغل میں — نہ تھا کچھ فرق جل میں اور تھل میں
نہ بستی تھی نہ ٹاپو تھا کہیں پر — اُسی کا دَور دَورہ تھا زمیں پر
مگر دنیا میں یکسانی کہاں ہے — جو اَب دیکھو تو وہ پانی کہاں ہے
یہاں ہر چیز ہے کروٹ بدلتی — ہر اِک حالت ہے چڑھتی اور ڈھلتی
کوئی شے ہو، ہوا ہو یا ہو پانی — سبھی کو ہے بڑھاپا اور جوانی
رہا باقی نہ وہ پانی کا ریلا — اُسے خشکی نے پستی میں دھکیلا
زمیں آہستہ آہستہ گئی چوس — چھپائے مال کو جس طرح کنجوس
تَری کا جب کہ دامن ہوگیا چاک — تو خشکی نے اُڑائی جا بہ جا خاک
پہاڑ اُبھرے ہوئے میدان پیدا — ہوئے میداں میں نخلستان پیدا
تَری کا گو ابھی پلّہ ہے بھاری — لڑائی ہے مگر دونوں میں جاری
کیا کرتے ہیں دونوں کاٹ اور چھانٹ — چلی جاتی ہے باہم لاگ اور ڈانٹ
تَری ہر دم چلی جاتی ہے اٹتی — کبھی خشکی بھی ہے کایا پلٹتی
تَری کا تین چوتھائی میں ہے راج — تو خشکی ایک چوتھائی میں ہے آج
نہیں چلتی تری کی سینہ زوری — زمیں اِک روز رہ جائے گی کوری
پہن رکھا تھا جب آبی لبادہ — مٹاپا بھی زمیں کا تھا زیادہ
مگر اب دن بہ دن چڑھتی ہے خشکی — تَری گھٹتی ہے اور بڑھتی ہے خشکی
کمی بیشی نہیں آتی نظر کچھ
بہت عمروں میں ہوتا ہے اثر کچھ

تشریح

انسانی زندگی میں پانی کی بڑی اہمیت ہے۔ بن پانی سب سؤن، اور 'جل ہی جیون ہے' جیسی باتیں پانی کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کو ثابت کرتی ہیں۔ کائنات کی تشکیل اور مخلوقات کی تخلیق اور نشو ونما میں پانی کی حصے داری سے سبھی بخوبی واقف ہیں۔ کھیتی باڑی، اناج، سبزی، پیڑ پودے، پھل پھول، ندی، تالاب، کنویں، صاف صفائی، شفافیت اور پاکیزگی، صحت وتندرستی، مکانات، عمارات کی تعمیر، غرض کہ روزمرہ زندگی کے ہر ایک کام میں 'پانی' ہمارے بہت کام آتا ہے۔ انسانی زندگی کی

بقا اور سماج کی ترقی، کل کارخانے، بجلی کی پیداوار، سائنسی ترقیات کا انحصار پانی ہی پر ہے۔

اسمٰعیل میرٹھی ایک اچھے انسان، اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انجینئر بھی تھے اور کامیاب استاد بھی تھے۔ انھوں نے کئی اہم اور مفید موضوعات پر سادہ و سلیس زبان میں کامیاب اور پُر اثر نظمیں لکھی ہیں۔

''آبِ زلال'' کا شمار بھی ایسی ہی مفید، دلچسپ، معلومات افزا نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں پانی کی اہمیت وضرورت کو سائنسی استدلال کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں اِسی امر کو ظاہر کرتے ہوئے وہ انسانوں سے مخاطب ہیں کہ اگر تم دانا اور سمجھ دار ہو تو اپنی طبیعت کی روانی یعنی تعمیری صلاحیتوں سے کام لے کر پانی کی اہمیت کو سمجھو۔ سائنسی نقطۂ نظر سے سائنس دانوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پانی دو ہواؤں یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن (H2o) سے مل کر بنا ہے اور اس کی یہ خوبی بھی ہے کہ یہ جہاں ٹھنڈا ہو کر برف کی صورت جم جاتا ہے وہیں گرم ہو کر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے یا فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی مادّی شئے ہے کہ جس کا اپنا کوئی خاص رنگ نہیں ہے اسی طرح پانی اپنا کوئی خاص ذائقہ بھی نہیں رکھتا۔ یہ موسم کا اشارہ پا کر ذرا میں ہوا بن جاتا ہے اور پھر ہوا پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

پانی کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مزاجاً نرم اور تر ہوتا ہے اور جیسی جگہ، جیسا برتن اس کو ملتا ہے یہ ویسا ہی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی ماحول میں ڈھلنے اور خود کو اس کے مطابق بنانے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ پانی کی ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ یہ کسی بھی صدمے، چوٹ یا ضرب سے متاثر نہیں ہوتا ہے یعنی اسے نہ تو کوئی نقصان ہوتا ہے نہ ہی یہ کسی چیز سے زخمی ہوتا ہے۔

پانی ہمیشہ نشیب یا پستی کی جانب بہتا ہے اور ہر طرح کی مصیبتوں یا آزمائشوں کے باوجود بھی ہموار ہو کر اپنا فرض ادا کرتا رہتا ہے۔ ہلکی چیزوں کو سر پر اُٹھا لیتا ہے اور بھاری چیزوں کو غوطہ دلا کر نیچے چھپا لیتا ہے۔ خالص پانی نہ تو گلتا ہے، نہ سڑتا ہے، نا ہی خراب ہوتا ہے۔ پانی کبھی ضائع یا ختم نہیں ہوتا، شکل وصورت اور نوعیت تبدیل کر کے اپنا وجود ہر حال میں برقرار رکھتا ہے۔ شاعر نے اس کے ذریعے ایک خاص پیغام انسانوں کو دیا ہے تا کہ وہ بھی ہر حال میں اپنا وجود، اپنی اہمیت، اپنی پہچان قائم رکھیں۔

پانی کی بدلتی ہوئی شکلوں اور صورتوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے اس نظم میں یہ بتانا چاہا ہے کہ پانی کو سورج کی جب گرمی لگتی ہے یا اسے آگ میں تپایا جاتا ہے تو وہ ہوا یا بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے یعنی

ہماری نظروں سے اوجھل ضرور ہو جاتا ہے لیکن ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح سردی پڑنے یا لگنے سے ہی پتھر کی طرح ٹھوس بن کر برف کی شکل میں جم جاتا ہے۔ دریا یا سمندر کا پانی سورج کی گرمی میں تپ کر بادل بن کر برسات کی شکل میں دوبارہ زمین پر آجاتا ہے۔ اس طرح پانی ہواؤں کے کاندھوں پر چڑھ کر بھی سیکڑوں میلوں کا سفر طے کرتا اور کبھی اولا، اوس یا پالا بن کر پھر سے پانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح پانی کبھی بھاپ، کبھی برف بن کر مختلف مختلف شکلیں اختیار کر کے انسانوں کو طرح طرح سے فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔ اسی کے دم سے دنیا میں نمی یا تراوٹ ہے ورنہ یہ دنیا آگ کی بھٹی بن جاتی۔ پانی ہی ہے جو ہمارے کھیتوں اور فصلوں کو ہرا بھرا اور شاداب بنائے رکھتا ہے۔ اسی کے سبب درخت پھلتے پھولتے اور ہرے بھرے بنے رہتے ہیں۔ ہر پتہ، پھل، پھول، شاخ اور جڑ سے کونپل تک پانی کی رسائی ہے۔ جہاں پانی نہیں پہنچتا وہ چیز سوکھ کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ یعنی پانی ہی زندگی، خوش حالی، تروتازگی، ترقی اور بہار و رونق و رنگ کی علامت ہے۔ اسے ماءالحیات بھی کہا جاتا ہے کہ اسی کے پینے سے انسان اور جانور زندہ اور صحت مند رہتے ہیں۔ ہر جگہ پانی کی ہی حکومت ہے، یہ کہیں سمندر، کہیں ندیاں، کہیں کنواں، کہیں جھیل و تالاب بن کر ہم سب کو فائدے پہنچاتا رہتا ہے۔ ہمارے جینے کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے۔

جب اس کائنات کی تخلیق ہوئی تو ہر جگہ پانی ہی پانی موجود تھا اور جل اور تھل میں یعنی خشکی اور تری میں بظاہر کوئی فرق نہیں تھا لیکن جیسے جیسے انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا اور پانی کا بے جا استعمال بڑھتا گیا، اسی طرح پانی زمین سے سمٹتا گیا اور نمی یا تری کی جگہ خشکی نے لے لی۔ زمین نے پانی کو اسی طرح جذب کر لیا جس طرح کوئی کنجوس اپنے مال و دولت کو چھپا لیتا ہے۔ کائنات میں ماحولیات کا توازن برقرار رکھنے میں پانی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہماری دنیا کو تروتازہ رکھتا ہے۔ جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں خاک اُڑنے لگتی ہے۔ زندگی مرجھا جاتی ہے، بے رنگ اور بے کیف بن جاتی ہے۔

ابھی بھی اس زمین پر پانی یعنی تری کا پلّہ بھاری ہے۔ لیکن تری اور خشکی کی جنگ جاری ہے۔ خشکی، تری پر غالب آنا چاہتی ہے، ابھی بھی زمین کے تین چوتھائی حصے پر پانی کی حکومت ہے، خشکی کا حصّہ صرف ایک چوتھائی ہے لیکن جس طرح خشکی کا زور و اثر بڑھتا جا رہا ہے، تری سمٹتی جا رہی ہے۔ زمین میں جب پانی زیادہ تھا تو وہ زیادہ تروتازہ اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن اب خشکی، گرمی بڑھتی جا رہی ہے اور پانی کی گھٹتی ہوئی مقدار کے سبب نمی یا تری کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، ایک سنگین مسئلہ ہے جس نے انسان اور کائنات کے وجود کے لیے کئی خطرات پیدا کر دیے ہیں۔

شاعر نے اس نظم میں انسانوں کو محض پانی کی اہمیت، ضرورت اور افادیت سے ہی آگاہ نہیں کیا ہے

بلکہ پانی کی حفاظت کے لیے بھی اُکسایا ہے۔ آج کے حالات کے اعتبار سے بھی یہ ایک اہم موضوع پر لکھی گئی نہایت اہم اور پُر اثر نظم ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس کی معنویت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعے سے انسانوں میں بیداری پیدا ہو جائے اور وہ پانی کی اہمیت کو سمجھ کر اس کی حفاظت کی کوشش کریں، یہی شاعر اسمٰعیل میرٹھی کا اصل مقصد ہے۔

II اچھا زمانہ آنے والا ہے

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ بجے گا محبت کا نقّارخانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دِکھلائیں گے اب بھلے دن
رُکے گا نہ عالم ترقی کیے بن کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

ہر اِک توپ سچ کی مددگار ہوگی خیالات کی تیز تلوار ہوگی
اسی پر فقط جیت اور ہار ہوگی کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

زبانِ قلم سیف پر ہوگی غالب دبیں گے نہ طاقت سے پھر حق کے طالب
کہ محکوم حق ہوگا دنیا کا طالب کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

زمانہ نسب کو نہ پوچھے گا ہے کیا مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا
اسی کو بڑا سب سے مانے گی دنیا کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ڈائن تفاخر پہ ہوگی نہ قوموں میں اَن بن
مشیخت کی خاطر اُڑے گی نہ گردن کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

عقیدوں کی مٹ جائے گی جب رقابت مذہب کو ہوگی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اُٹھ جائے چھپّر کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

تشریح

جیسا کہ نظم کے عنوان سے ظاہر ہے یہ ایک ایسی پُر اُمید اور با مقصد نظم ہے جس میں اسمٰعیل میرٹھی نے تعمیری نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے خوش حالی اور اچھے دنوں کے آنے کی بشارت دی ہے۔ چھوٹی بحر

اور سادہ و سلیس زبان اور سلجھے ہوئے اندازِ بیان کے ذریعے شاعر اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کر کے اچھا زمانہ آنے کی خوش خبری اس طرح سنا رہا ہے:

پہلا بند: اب ہم آزاد ہیں، خود مختار ہیں، خود کفیل ہیں اس لیے ملک میں ہر طرف خوشیوں کا شامیانہ لگا ہوا نظر آئے گا۔ ہر جانب محبت کے نغمے سنائی دیں گے۔ سبھی لوگ ایک دوسرے کی حمایت کریں گے۔ لہٰذا شاعر صبر کرنے اور اچھا زمانہ آنے کی خبر دے رہا ہے۔

دوسرا بند: اگر چہ شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ خود آنے والے اچھے زمانے کی روشنی نہیں دیکھ پائے گا لیکن اسے اس بات کا پورا یقین ہے کہ اب بھلے دن کا اُجالا ضرور آئے گا اور یہ دنیا ترقی کی راہوں پر آگے ضرور بڑھے گی۔

تیسرا بند: اب ہر ایک توپ ظلم نہیں ڈھائے گی بلکہ حق پرستوں کے لیے مددگار ثابت ہوگی یعنی اب جابر طاقتیں ظلم نہیں ڈھا سکیں گی۔ ہر انسان کو جینے کا اور اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہوگا اور جیت اور ہار کا فیصلہ یعنی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار بھی ان ہی باتوں پر ہوگا۔

چوتھا بند: شاعر جنگ اور بدامنی کی جگہ امن اور سکون کی بات کو ترجیح دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اب قلم کی زبان، تلوار پر غالب ہو جائے گی یعنی اظہار کی آزادی میسر آئے گی اور اب کسی حق پسند انسان، سچائی کے طالب انسان کو کسی جابر یا طاقت ور کے ظلم کے آگے جھکنا نہیں پڑے گا۔

پانچواں بند: اب خاندانی رعب داب کا جاہ وجلال کام نہیں آئے گا بلکہ انسان کے ذاتی اوصاف ہی اس کی ترقی، خوش حالی اور کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔ اور وہی انسان اہم، بڑا اور قابل تعریف سمجھا جائے گا جو کہ ذاتی جوہر اور ذاتی ہنر سے آراستہ ہوگا۔

چھٹا بند: اب امن کا دور دورہ ہوگا۔ جنگ یا لڑائی سے نفرت کی جائے گی، خاندانی فخر ومباہات کے سبب اب کوئی باہمی ان بن یا اختلاف پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اب شیخی یا بے جا فخر کے سبب کسی کی گردن نہیں اُڑائی جائے گی۔ نئے زمانے کے حالات میں انسان، انسانیت کا برتاؤ کرے گا۔

ساتواں بند: یہ زمانہ ایسا ہوگا کہ جس میں عقیدوں اور آستھاؤں کا اختلاف ختم ہو جائے گا اور سبھی مذاہب کے لوگ تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ دیں گے اور اس طرح ان کی طاقت میں بھی ایسا اضافہ ہو جائے گا جو کہ آپس میں مل جل کر رہنے کے سبب ہوتا ہے۔

آٹھواں بند: شاعر اپنی نظم کے اس آخری بند میں اپنے قارئین کو یہ تلقین کرتا ہے، یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ سب ہی اہلِ وطن ایک دوسرے کے لیے مددگار ثابت ہوں، ایک دوسرے کی بے لوث خدمت کریں کہ ہر مرد اور عورت کے لیے یہ بات اس لیے بھی مناسب اور ضروری ہے کہ مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے سے مسائل آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی مشکلیں

راحتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ایک دوسرے کی مدد سے ایک دوسرے کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

یہی کامیاب اور خوش حال زندگی کا راز ہے۔اس نظم میں شاعر نے اس راز سے واقف کرانے اور اپنی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرانے کی کوشش کی ہے۔یہ سبھی ایسی اچھی اور مفید باتیں ہیں جن پر عمل کر کے ہم اپنی زندگی کو خوش حال اور اپنے سماج، اپنے ملک کو مضبوط اور ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی کی ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض شاعری ہی نہ تھے، انھوں نے اپنی نظموں سے سماج کو بیدار کرنے، قوم کے افراد میں حب الوطنی، اتحاد و عمل کا جذبہ پیدا کرنے، ان کی اصلاح کرنے، انھیں اچھا انسان بنانے اور اُن کے مستقبل کو سنوارنے کا اخلاقی اور ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔اردو کے ادبِ اطفال میں انھیں ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہے۔

9.7 آپ نے کیا سیکھا

- اسمٰعیل میرٹھی کی زندگی اور عہد کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
- ان کی نظم نگاری اور فن کا مطالعہ کیا۔
- اردو نظم کی تاریخ کی واقفیت حاصل ہوئی۔
- اسمٰعیل میرٹھی کی دو منتخب نظموں کا مطالعہ مع تشریح کیا۔

9.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1 اسمٰعیل میرٹھی کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

2 اسمٰعیل میرٹھی کے کلام کی خصوصیات تحریر کیجیے؟

3 اسمٰعیل میرٹھی نے اپنی نظم 'آبِ زلال' میں پانی کی کیا اہمیت اور افادیت بیان کی ہے؟

4 ''یہ مل کر دو ہواؤں سے بنا ہے'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

5 پانی کے پتھر بن جانے کا کیا مطلب ہے؟

6 جب کہیں بستی اور ٹاپو نہیں تھے تو زمین پر کس کا دَور دَورہ تھا؟

7 اسمٰعیل میرٹھی نے 'آبِ زلال' کی کیا خوبیاں بیان کی ہیں؟

8 نظم ''اچھا زمانہ آنے والا ہے'' کا بنیادی پیغام کیا ہے؟

9 ''تنے گا مسرت کا اب شامیانہ'' سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

10 نظم کے دوسرے بند میں شاعر نے کس بات کا اظہار کیا ہے؟

11 ''زبان قلم سیف پر ہوگی غالب'' اس مصرعے میں شاعر کس بات کی جانب اشارہ کر رہا ہے؟

12 ''مگر وصفِ ذاتی کا ڈنکا بجے گا'' اس مصرعے میں شاعر کیا بات کہنا چاہتا ہے؟

13 عقیدوں کی رقابت مٹ جانے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟

14 نظم کے آخری بند میں شاعر ہر مرد و زن کے لیے کس بات کی تلقین کر رہا ہے؟

9.9 سوالات کے جوابات

1 اسمٰعیل میرٹھی 12/نومبر 1844ء کو میرٹھ شہر میں پیدا ہوئے تھے۔

2 اسمٰعیل میرٹھی بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کا کلام خاص مقصد یعنی انسان دوستی، اخلاقی اقدار، اتحاد و عمل، محبت و یگانگت کا ترجمان ہے۔ وہ بنیادی طور پر بچوں کے شاعر تھے۔ انھوں نے بچوں کی پسند، نفسیات، دلچسپی اور ان کی تعلیم و تربیت کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر سادہ و سلیس زبان اور آسان اندازِ بیان میں مختلف موضوعات پر اصلاحی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ اردو کے ادبِ اطفال میں انھیں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے۔

3 اسمٰعیل میرٹھی نے نظم 'آبِ زلال' میں پانی کی کیفیت، حیثیت، اہمیت اور افادیت و ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے ہماری کائنات اور زندگی کی بقا، خوش حالی، شادابی اور ترقی کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ پانی کے مختلف رنگ، روپ اور خوبیاں بیان کی ہیں۔ ماحول اور حالات کے اعتبار سے اس کی بدلتی شکلوں کو پیش کر کے اس کی مختلف صفات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ پانی دراصل دو قسم کی ہواؤں سے مل کر بنا ہے۔ جو کہ گرمی پا کر اگر بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے تو ٹھنڈ میں برف بن جاتا ہے وہ کبھی دریاؤں، سمندر اور کنوؤں میں رواں دواں رہتا ہے، کبھی بادلوں کی سیر کر کے بارش کی صورت زمین کو سیراب کر دیتا ہے تو کبھی شبنم، اولا بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسے جس برتن میں رکھو یا ڈالو وہ ویسا ہی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ نشیب یعنی نچلی سطح کی جانب بہتا ہے اور ہر طرح کی ایذا سہنے کے باوجود ہموار رہتا ہے۔ وہ ہلکی پھلکی چیزوں کو اپنے سر پر اُٹھا لیتا ہے یعنی باہر کر دیتا ہے جب کہ بھاری چیزوں کو غوطہ کھلا کر اپنی تہہ میں چھپا لیتا ہے۔

آبِ زلال کی سب سے بڑی خصوصیت یا خوبی یہی ہے کہ وہ نہ کبھی جلتا ہے، نہ خراب ہوتا ہے، نہ سڑتا ہے اور نہ ہی گلتا ہے۔ وہ کبھی بھی ضائع نہیں ہوتا ہمیشہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بنا رہتا ہے۔ درختوں، پھل، پھولوں، پتیوں کی وہ جان ہے۔ اسی کے دم سے ہماری کھیتیاں ہری رہتی ہیں۔

انسانوں، جانوروں سبھی جان داروں کا جینا اسی پر منحصر ہے۔ وہی ہمارا کھانا ہضم کر کے ہمارے جسم کو صحت مند اور توانا رکھتا ہے۔ پانی کائنات میں ماحولیاتی توازن پیدا کرنے میں

اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زمین کو نم اور زرخیز بناتا ہے۔ خشکی کو تری یا نمی میں تبدیل کرتا ہے۔ ہماری زمین کے تین چوتھائی حصے میں پانی ہے جب کہ ایک چوتھائی حصّہ میں خشکی ہے۔ آخر میں شاعر نے متنبہ کیا ہے کہ:

اگر پانی کی حفاظت نہیں کی گئی تو پوری کائنات اور انسانی اور حیوانی زندگی کے وجود کو زبردست خطرہ پیدا ہو جائے گا اور ماحولیاتی توازن بگڑ جانے سے یہ دنیا جینے اور رہنے کے قابل نہیں رہ پائے گی۔ شاعر نے پوری نظم میں پانی کی اہمیت، ضرورت، کیفیت اور افادیت پر سائنٹفک انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

4 سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق پانی دو قسم کی ہواؤں یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن (H_2o) سے مل کر بنا ہے۔

5 پانی ٹھنڈک پا کر برف بن جاتا ہے اسی بات کو شاعر نے پانی کے پتھر بن جانے سے تعبیر کیا ہے۔

6 جب زمین انسانوں یا جانداروں سے آباد نہیں ہوئی تھی تو اس وقت بھی اس زمین پر پانی کی حکمرانی تھی یعنی ہر جگہ پانی ہی پانی موجود تھا۔

7 آبِ زلال صاف شفاف میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔ شاعر نے اس کی خوبیاں گنواتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ نہ تو گلتا ہے نہ جلتا ہے نہ سڑتا ہے اور نہ ہی خراب ہوتا ہے۔ اسے جس برتن میں ڈالو ویسا ہی بن جاتا ہے۔ اسے ماءالحیات بھی کہتے ہیں کیونکہ انسان، جانور، پیڑ پودے، کھیت، دریا سبھی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے۔ کائنات اور جان داروں کی نشو ونما، ترقی اور خوش حالی میں آبِ زلال کی بڑی اہمیت ہے۔

8 نظم 'اچھا زمانہ آنے والا ہے' کے بنیادی پیغام میں انسانی خوش حالی، ترقی، شادمانی، امن و امان کی خوش خبری سنائی گئی ہے۔ شاعر اپنے قارئین کو صبر کی تلقین کر کے اچھا زمانہ آنے، اچھے اور موافق وسازگار حالات پیدا ہونے کی بشارت دیتا ہے۔

9 اس مصرعے سے شاعر کی یہ مراد ہے کہ اب ہر جگہ اور ہر طرف خوشیوں کے شامیانے تانے جائیں گے یعنی چین وسکون اور خوش حالی آجائے گی۔

10 نظم کے دوسرے بند میں شاعر نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ وہ نہیں ہوگا لیکن زمانہ کی ترقی کی رفتار آگے بڑھتی ہی رہے گی اور آنے والی نسلیں اس شاندار ترقی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی۔

ان کا پورا فائدہ اُٹھائیں گی۔

11 اس مصرعے میں شاعر نے صاف طور پر اور پورے یقین کے ساتھ قلم کی طاقت یعنی علم و ادب کی ترقی کی جانب اشارہ کر کے بتانا چاہا ہے کہ تلوار کی جگہ قلم سے کام لیا جائے گا یعنی سب کو سب کا حق دیا جائے گا۔ کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

12 اس مصرعے میں شاعر نے بڑے پتے کی بات کہی ہے وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اب خاندان کی شان اور دولت کی فراوانی سے نہیں بلکہ ذاتی ہنرمندی اور خوبیوں سے کام چلے گا۔ ذاتی خوبیاں ہی انسان کی ترقی اور خوش حالی کا سبب بنیں گی۔

13 جب عقیدوں کی رقابت یعنی ٹکراؤ مٹ جائے گا تو تعصب کا زہر بھی ختم ہو جائے گا اور بھائی چارے اور انسانیت کی فضا پیدا ہو جائے گی۔

14 نظم کا آخری بند پوری نظم کا نچوڑ ہے جس میں شاعر سبھی انسانوں کو مل جل کر رہنے، ایک دوسرے کی مدد کرنے کا مشورہ دیتا ہے، یہ بات ہر مرد، عورت کے لیے اس لیے لازمی ہے کہ اسی سے ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے اور مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

9.10 فرہنگ

لفظ	معنی
آبِ زلال	میٹھا پانی
دانا	سمجھ دار
روانی	بہاؤ
قدرت	فطرت
رضا	مرضی
رسائی	پہنچ
نہایت	بہت زیادہ
کھٹ پٹ کرنا	لڑائی کرنا

صدمہ	غم
ریزہ ریزہ	ٹکڑا
تواضع	وضع داری
پستی	نچلا حصّہ
جفا	ستم
ہموار	برابر سطح
سرکشی	زور زبردستی
سروکار	معاملہ
انبار	ڈھیر
بلندی	اونچائی
غوطہ	ڈُبکی
ہرگز	بالکل
نابود	وجود نہ ہونا
حیوان	جانور
رسد	غذا
زراعت	کھیتی
موروثی	وراثت میں ملنے والی
صناعت	فیکٹری
یکساں	ایک جیسا
خشکی	سوکھا
نسب	خاندان

وصف	خوبی
تفاخر	فخر کرنا
مشیخت	شیخی
عقیدہ	یقین
رقابت	اختلاف
تعصّب	بھید بھاؤ
زن	عورت

9.11 کتب برائے مطالعہ

کلیات اسمٰعیل میرٹھی — اسمٰعیل میرٹھی — دی اورینٹل پبلشنگ کمپنی، میرٹھ، 1910

جدید شاعری کا نقطۂ آغاز۔ اسمٰعیل میرٹھی — شاداب علیم — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2010

جدید اردو شاعری — ڈاکٹر عبادت بریلوی — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1983

اکائی 10 پنڈت برج نراین چکبست کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 چکبست کی شاعری

10.3.1 چکبست کا تعارف

10.3.2 چکبست کی شعری خصوصیات

10.3.3 چکبست کی نظموں کی تشریحات

I. راماین کا ایک سین

II. مرثیۂ بال گنگادھر تلک

10.4 آپ نے کیا سیکھا

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالات کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- چکبست کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے
- چکبست کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے
- چکبست کی شعری انفرادیت اور مرتبہ سے شناسائی حاصل کریں گے
- چکبست کی نظم نگاری کی خصوصیات سے روشناس ہوں گے
- چکبست کی دو نظموں کی تشریح سمجھیں گے

10.2 تمہید

برج نراین چکبست لکھنوی کا شمار اردو کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ عہد برطانیہ میں وہ لکھنؤ کے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد نے کشمیر سے ہجرت کر کے مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی چکبست نے غزل کی دہلیز سے اردو شاعری میں قدم رکھا لیکن وہ بنیادی طور پر

نظم کے شاعر ہیں۔ حب الوطنی اور اصلاح معاشرہ ان کی شاعری کا خاص موضوع رہا۔ چکبست کے یہاں لفظ قوم کا بڑا مثبت تصور ملتا ہے۔ کشمیری اور لکھنوی تہذیب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جدید طریقۂ تعلیم اور تعلیم نسواں پر انہوں نے بطور خاص توجہ دی اور اپنے افکار و نظریات کو شاعری کے ذریعہ پیش کیا۔ وہ ہمیشہ کشمیری قوم کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ انہوں نے کشمیری خواتین کے لیے ایک کلب بھی قایم کیا تھا۔ چکبست نے شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، شخصی نظمیں بھی لکھیں۔ ان کے کل اشعار کی تعداد 2025 بتائی جاتی ہے جبکہ غزل کے اشعار کی تعداد 477 ہے اور غزلوں کی تعداد 58 ہے۔ چکبست کی بیشتر نظمیں مسدس کی شکل میں ہیں۔

چکبست شام کا وقت ادبی سماجی اور سیاسی کاموں میں گذارتے تھے۔ ادبی حلقوں کے علاوہ وکلا کے حلقے میں بھی بہت مقبول تھے۔ شہنشاہ حسین وکالت میں ان کے استاد تھے۔ وہ محبّ وطن اور سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ مدن موہن مالویہ اور سرسید کی تعلیمی فکر کی وہ تعظیم کرتے تھے۔

شرر سے چکبست کے ادبی معرکے بھی رہے۔ اس اکائی میں چکبست کی حیات و ادبی خدمات کے ساتھ ان کی شاعری کا مختصر تعارف اور دو نظموں (راماین کا ایک سین اور بال گنگا دھر تلک) کی تشریح کی گئی ہے۔

10.3 چکبست کی شاعری

10.3.1 چکبست کا تعارف

برج نراین چکبست کی پیدائش 19 رجنوری 1882 میں فیض آباد کے ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی۔ ان کے اجداد اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے۔ چکبست کے والد پنڈت اودت نرائن پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہد پر فائز تھے۔ انہیں شاعری سے شغف تھا اور شعر بھی کہتے تھے۔ والد کے انتقال کے وقت چکبست کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔ چکبست کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی ان کی والدہ لچھی شوری نے چکبست کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

1895 میں چکبست نے کاظمین مڈل اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ 1897 میں گورنمنٹ جوبلی کالج میں داخلہ لیا اور 1900 میں میٹرک کی سند حاصل کی۔ 1902 میں کیننگ کالج سے ایف.اے. مکمل کیا 1905 میں بی اے اور 1907 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری

حاصل کی اور مستقل طور پر وکالت کا پیشہ اختیار کرلیا۔

چکبست کی پہلی شادی 1905 میں جوالا کے ساتھ ہوئی لیکن وہ ایک سال بعد فوت ہوگئیں۔ دوسری شادی 1907 میں چھیما شوری آغا سے ہوئی ان سے کئی اولادیں ہوئیں لیکن صرف ایک لڑکی مہراج کماری زندہ رہیں۔

ابتدا ہی سے ان کی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی بارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے اور 1894 میں پہلی نظم 'حب قومی' کے نام سے لکھی جسے کشمیری پنڈتوں کی کانفرنس کے ایک اجلاس میں سنائی۔ چکبست منشی سید افضل علی خاں لکھنوی کے شاگرد تھے۔

چکبست لکھنوی تہذیب کے پروردہ اور ادبی قدروں کے امین تھے۔ حقہ پیتے اور پان کھاتے تھے۔ شیروانی، گول ٹوپی اور چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے۔ بڑے نفیس اور وضع دار انسان واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ کشمیری براہمنی تہذیب اور خاندانی وجاہت کو قایم رکھا۔ 1903 میں انہوں نے کشمیری ینگ مین ایسوسی ایشن اور بہار لائبریری قایم کی۔ مضامینِ چکبست ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

1901 میں انہوں نے ہندوستان کے معروف جج مہادیو گووندرانا ڈے کی وفات پر مسدس کی شکل میں مرثیہ کہا جو چکبست کا پہلا مرثیہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1906 میں اپنی مشہور نظم ''راماین کا ایک سین'' کہی۔ چکبست نے مختلف اوقات میں مشاعروں کے لیے غزلیں بھی کہیں۔ چکبست کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ مذہب کے سلسلے میں ان کا سخت رویہ نہیں تھا۔ وہ اینی بیسنٹ کی، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن بھی رہے۔ 1917 میں انہوں نے 'امام باڑہ آصف الدولہ' پر نظم کہی۔ اور چند نظمیں بچوں کے لیے بھی کہیں۔ چکبست ان کا تخلص نہیں بلکہ خاندانی نام تھا لیکن یہ نام شاعری میں تخلص کے طور پر ہی استعمال کیا۔ 12 رفروری 1926 کو چوالیس برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا اور لکھنؤ میں آخری رسومات ادا کی گئیں۔

اثر لکھنوی نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ 'چکبست کا کلام ان کے کردار کا آئینہ ہے'۔

10.3.2 چکبست کی شعری خصوصیات

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی کا شمار اردو کے ممتاز نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ابتدائی عمر ہی سے طبیعت موزوں تھی اور شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ چکبست کے والد اودت نراین چکبست شاعر تھے اور

یقین تخلص کرتے تھے۔ گھر کے ادبی ماحول اور لکھنو کی تہذیبی فضا نے ان کے ذوق شعری کو اور بھی جلا بخشی، لکھنو کے معروف شاعر سید افضل علی خاں لکھنوی سے اصلاح لی اور شرف تلمذ کیا۔ میر انیس کی بکری کی موت پر چکبست نے شعر گوئی کا آغاز کیا اور یہ شعر کہا۔

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

لیکن چکبست نے اپنی پہلی باقاعدہ نظم بارہ برس کی عمر میں 'حب قومی' کے عنوان سے کہی جو سوشل کانفرنس کشمیری پنڈتوں کے چوتھے اجلاس میں پڑھی تھی۔

حب قومی کا زبان پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے

چکبست اقبال کے ہم عصر تھے ابتدا میں انہوں نے حالی اور محمد حسین آزاد کی طرز پر نظمیں کہیں۔ اور غزل کی قید سے آزاد ہو کر نظم گوئی کو اپنا میدان بنایا۔

نظم نگاری

چکبست بہت ذہین اور حساس واقع ہوئے تھے۔ وہ شاعری کے ذریعہ ملک و ملت اور خصوصاً کشمیریوں کو پیغام دینا چاہتے تھے۔

چکبست نے اپنی شاعری کا باقاعدہ آغاز 1894 میں نظم گوئی سے کیا وہ میر انیس سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی بیشتر نظمیں مسدس کی شکل میں کہیں۔ چکبست نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی اور شخصی مرثیے بھی کہے ان کے سیاسی رہنماؤں پر لکھے ہوئے سا تو مرثیے بہت مشہور ہوئے لیکن 1916 کے آس پاس محبّ وطن شاعر کی حیثیت سے ان کی شناخت قایم ہوئی۔

1926 میں 'صبح وطن' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ شایع ہوا۔ جس میں نظمیں، غزلیں اور شخصی مرثیے بھی شامل ہیں اور کل اشعار کی تعداد 2025 بتائی جاتی ہے۔ ابتدائی دور میں ان کی نظمیں گائے، کرشن اور وید کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔ 1914 کے سال میں انہوں نے چار غزلیں اور دو مرثیے بھی کہے۔ بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے اور راماین کا ایک سین، چکبست کی اہم نظمیں ہیں چکبست ایک کامیاب وکیل بھی تھے غالباً اسی مصروفیت کی وجہ سے ان کی زندگی میں شاعری کو اولیت حاصل نہیں رہی۔

چکبست کی شخصیت میں کشمیری اور لکھنوی تہذیب کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اور یہی رنگ ان کے کلام اور خصوصاً نظموں میں غالب نظر آتا ہے چکبست نے سبھی نظمیں مسدس کی شکل میں کہیں۔

فریادِ قوم (1914) نالۂ درد (1916) وطن کا راگ (1917) اور نظم جلوۂ صبح میں تشبیہات کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔

دریائے فلک میں تھا عجیب نور کا عالم
چکّر میں تھا گرداب صفتِ نیّرِ اعظم
اٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شرر دم
سیّارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم

چکبست کے یہاں سوز و گداز، جذبات کی مرقع کشی، عمل پیہم کا درس، سماجی و اصلاحی اور سیاسی شخصیات پر نظمیں ان کے فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مناظر فطرت کے ساتھ کلاسیکی روایت کو بھی قایم رکھا ہے۔

چکبست کی موضوعاتی نظموں کا بیشتر حصہ حب الوطنی سے متعلق ہے۔ نظم 'فریادِ قوم' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جو دَب کے بیٹھ رہے سر اٹھاؤ گے پھر کیا
عدوئے قوم کو نیچا دکھاؤ گے پھر کیا
جفا وجور کی ذلّت مٹاؤ گے پھر کیا
تم اپنے بچّوں کو قصّے سناؤ گے پھر کیا

چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے علاوہ اردو کی ادبی روایت، لکھنوی تہذیب، کشمیری برہمنوں کے مسائل، خواتین کے مسائل، سماجی، سیاسی اور ادبی ماحول اور ذاتی ترجیحات شامل ہیں۔ انہوں نے کشمیر کا سفر بھی کیا۔ جس سے سرزمین کشمیر پر ان کی حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہوا۔

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

نظم 'راماین کا ایک سین' امیجری اور جذبات نگاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام　　راہِ وفا کی منزلِ اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کو زیارت کا انتظام　　دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام

چکبست کے کلام میں تشبیہات و استعاروں کے علاوہ موسیقیت، شعریت، رمز و ایما، پیکر تراشی، فطرت کی مرقع کشی، مزاحیہ اور عشقیہ شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ چکبست نے کہا تھا

دل میں اک رنگ ہے ہوتا ہے جو لفظوں سے بیاں
لے کی محتاج نہیں ہے مری فریاد و فغاں

غزل گوئی

چکبست نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی، انہوں نے غزل کے دامن کو وسعت بخشی، نئی تراکیب و اصطلاحات اور موضوعات سے مزین کیا اور اس میں ندرت پیدا کی۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، اصلاحی، ملی اور قومی موضوعات کو غزل میں جگہ دی، وطن سے محبت ان کی غزلوں کا محبوب موضوع رہا۔ چکبست کی غزل کا یہ شعر ان کے اس جذبے کی نمائندگی کرتا ہے:

وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامان مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

حب الوطنی کے جذبات کو چکبست نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

حب قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادۂ الفت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے

چکبست کے یہاں عشقیہ عناصر بھی موجود ہیں۔ گل و بلبل کی علامتیں مذہبی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، شیخ و برہمن اور فلسفۂ حیات و ممات کا مثبت تصور پایا جاتا ہے۔ چکبست مے نوشی سے محرومی کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں۔

مئے گل رنگ لٹتی یوں درِ مے خانہ وا ہوتا
نہ پینے میں کمی ہوتی نہ ساقی سے گلہ ہوتا

فلسفۂ حیات وممات سے متعلق چکبست کا خیال ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کے خالص عشقیہ شعر کا ایک نمونہ دیکھیے۔

بے حجاب آج تری نرگس مستانہ ہے
اب جسے ہوش کا سودا ہے وہ دیوانہ ہے

چکبست نے اپنے فکر وفن کے ذریعہ اردو شاعری میں نئے موضوعات قایم کیے لکھنوی شعری روایت کو فروغ دینے میں اہم کردار نبھایا اور اردو کے شعری افق کو بلندی عطا کی۔

10.3.3 چکبست کی نظموں کی تشریحات

I راماین کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے سِتم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دِل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے، یہ ہے شِدّتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں، زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں، کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نِگاہ
جُنبش ہوئی لبوں کو، بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

روکر کہا! خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں؟ میں جانتی ہوں، کس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے مُنھ سے نہ ہرگز کہوں گی 'ہاں'
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں؟
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں؟

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم تُم مرے لال، تھے مُجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں، پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں، تو آگ لگاؤں گی راج کو

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریادِ درد خیز اُس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغِ تیز
عالم یہ تھا قریب، کہ آنکھیں ہوں اشک ریز لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گُریز
سوچا یہی، کہ جان سے بے کس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کر ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور مایوس کیوں ہیں؟ آپ اُلم کا ہے کیوں وفور؟
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام بعدِ سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام قائم اُمید ہی سے ہے، دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں، کسی کو خبر نہیں

اپنی نگاہ ہے کرمِ کار ساز پر صحرا چمن بنے گا، وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت، دامنِ مادر سے کم نہیں

تشریح

راماین کا ایک سین پنڈت برج نراین چکبست کی مشہور نظم ہے یہاں ہم اس نظم کے منتخبہ بند کی الگ الگ تشریح کریں گے

رخصت ہوا.....غم ہوگا اور بھی۔

رام چندر جی اپنے باپ راجا دشرتھ سے رخصت لے کر ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آبدیدہ اپنے دامن سے آنسو پوچھتے ہوئے اپنی ماں کوشلیا کے حضور میں رنجیدہ اور غمناک حالت میں ان سے رخصت لینے کے لیے یہ سوچتے ہوئے حاضر ہوئے کہ انہوں نے اپنی ماں کے سامنے بے بسی اور بے کسی کا اظہار کیا تو غم کی حالت میں دیکھ کر وہ اور بھی اداس اور غم زدہ ہو جائیں گی۔

دل کو سنبھالتا ہوا.....تصور سنگ ہے۔

رام چندر جی غم زدہ خاموشی کی کیفیت میں خود کو سنبھالتے ہوئے کسی طرح اپنی ماں کے پاس پہنچے، ماں خستہ حال اپنے بیٹے رام چندر جی کی جدائی کے غم میں بے بس و لاچار کمرے کے دروازے پر پتھر بنی ہوئی بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ماں کوشلیا کا رنگ بیٹے کی جدائی کے خوف سے زرد پڑ گیا تھا اور جسم میں خون خشک ہو چکا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ انسان نہیں بلکہ پتھر کی مورتی کے مانند ہیں۔

کیا جانے کس خیال.....بولنے لگا۔

ماں اپنے گوشہ جگر کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی ایک پاکیزہ خیالات رکھنے والی مقدس ماں کی نظر اچانک اپنے بیٹے نور نظر رام چندر جی پر پڑی اور اس نے حسرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا اور سرد آہ بھر کر زبان سے کچھ کہنا چاہا اور اسکی آنکھوں سے زار و قطار آنسو گرنے لگے۔

چہرے کے رنگ سے دل کی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جسم کا ہر حصہ بے چینی اور بے بسی کی کیفیت بیان کر رہا تھا۔

روکر کہا خموش.....دلارے کو بھیج دوں

ماں نے نہایت ہی پرسوز انداز میں آبدیدہ ہو کر کہا کہ اے لخت جگر، تم خاموش کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں، میں یہ جانتی ہوں کہ تم یہاں میرے پاس کس لیے آئے ہو۔ تم بن باس کے لیے رخصت لینا چاہتے ہو۔ اگر چہ سب کی خوشی اسی میں ہے کہ تم صحرا کے لیے روانہ ہو جاؤ لیکن میں تمہیں ہرگز اجازت نہیں دے سکتی اور زبان سے یہ کہنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں اپنے نور نظر راج دلارے کو جوگی بنا کر سنسان و ویران صحرا کے لیے روانہ کر دوں یہ مجھے ہرگز منظور نہیں ہے۔

لیتی کسی فقیر کے گھر.....آگ لگاؤں گی راج کو

رام چند جی کی ماں کوشلیا خود سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس راج گھرانے سے بہتر تھا کہ میں کسی فقیر کے گھر میں پیدا ہو جاتی تو مجھے آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ یہ عزت و ناموس اور شوکت و حشمت سانپ بن کر مجھے نہ ڈستے۔ تمہاری موجودگی میرے لیے راج پاٹ اور سلطنت سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تخت و تاج میرے لیے بے معنی ہیں۔ اگر میرا لال میرے پاس نہیں ہے تو وہ جاہ و حشم سب کچھ میرے لیے بے معنی ہیں یعنی اس تاج و تخت کے بدلے اگر کوئی مجھے میرا بیٹا لوٹا دے تو مجھے اس سے زیادہ اور بڑی خوشی کوئی نہیں ہو سکتی۔

سن کر زباں سے.....ماں اور مر نہ جائے

ماں کی آہ و زاری اور فریاد کو سن کر رام چندر جی کو سخت تکلیف ہوئی وہ پہلے ہی سے غم زدہ اور ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو ٹپک رہے تھے لیکن انہوں نے رونے سے گریز کیا اور صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے ماں کے سامنے پہنچے یہ سوچتے ہوئے کہ اگر اس کے سامنے اظہار غم کیا تو کہیں وہ جدائی کے غم سے جاں بحق نہ ہو جائیں۔

پھر عرض کی..... پروردگار کی

ماں کے حضور میں حاضر ہو کر بیٹے نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو اس قدر غمگین اور ناشاد ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس عالم پیری میں آپ کو ہماری جدائی سے یقیناً صدمہ پہنچا ہے صبر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ شاید خدا کی اسی میں کوئی مصلحت ہے ایک دن یہ غم ضرور خوشیوں میں

تبدیل ہوگا اور اس خزاں رسیدہ موسم میں بہار آئیگی۔

اور آپ کو.....کسی کو خبر نہیں

رام چندر جی ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کو پریشان ہونے اور فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے امید پر دنیا کا نظام قایم ہے چودہ برس دیکھتے ہی دیکھتے گذر جائیں گے اور ہم خوش وخرم اپنے وطن واپس آکر ہمیشہ آپ کے ساتھ خوش حال زندگی بسر کریں گے۔ خوشی وغم زندگی کا حصہ ہیں مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔

اپنی نگاہ ہے.....دامن مادر سے کم نہیں

رام چندر جی اپنی ماں کوشلیا سے کہتے ہیں کہ ہمیں خدا کی ذات پر کامل یقین ہے وہ اگر مہربان ہو تو صحرا کو بھی چمن میں تبدیل کرسکتا ہے، وہ کبھی بھی اور کسی بھی حال میں اپنے بندوں سے بے خبر نہیں رہتا اور اس سرزمین پر اسی کی حکمرانی ہے۔ خدا کا کرم شامل حال ہے تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ جنگل میں بھی گھر کی طرح آسائش اور آرام مہیا کرسکتا ہے اور صحرا کو ماں کا آنچل بنا سکتا ہے۔

II مرثیۂ بال گنگادھر تلک

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار　　روشنی صبحِ وطن کی ہے، کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے، سویا ہے وطن کا سردار　　طنطنہ شیر کا باقی نہیں، سونی ہے کچھار
بے کسی چھائی ہے، تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اٹھ گیا دولتِ ناموس وطن کا وارث　　قومِ مرحوم کے اعزازِ کہن کا وارث
جاں نثارِ ازلی، شیر دکن کا وارث　　پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

موت مہراشٹ کی تھی، یا ترے مرنے کی خبر　　مُردنی چھا گئی انسان تو کیا پتھر پر
پتّیاں جھک گئیں، مرجھا گئے صحرا کے شجر　　رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر
سرد و شاداب ہوا رُک گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تھا نگہبانِ وطن دبدبۂ عام ترا　　نہ ڈِگین پانو یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے وہ تھا کام ترا　　نیند سے چونک پڑے، سن جولیا نام ترا

یاد کرکے تجھے مظلومِ وطن روئیں گے
بندۂ رسمِ جفا چین سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا　　آبرو تیرے لیے قوم سے پیمانِ وفا
عاشقِ نامِ وطن، کُشتۂ درمانِ وفا　　مردِ میدانِ وفا، جسمِ وفا، جانِ وفا

ہوگئی نذرِ وطن ہستیِ فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری، نہ جوانی تیری

اوجِ ہمت پہ رہا تیری وفا کا خورشید　　موت کے خوف پہ غالب رہی خدمت کی امید
بن گیا قید کا فرمان بھی راحت کی نوید　　ہوئے تاریکیِ زنداں میں ترے بال سفید

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
آہ وہ قید ستم اور بڑھاپا تیرا

لاش کو تیری سنواریں جو رفیقانِ وطن　　ہو جبیں کے لیے صندل کی جگہ خاکِ وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن　　دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شورِ ماتم نہ ہو، جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چِتا تیروں کی

تشریح

ہندوستان کے عظیم سیاسی رہنما بال گنگا دھر تلک کی وفات پر پنڈت برج نراین چکبست نے ایک تعزیتی نظم یعنی مرثیہ کہا تھا۔

موت نے رات.....گری جاتی ہے

رات کی تاریکی میں ہندوستان کے ایک عظیم سیاسی رہنما بال گنگا دھر تلک کی وفات ہوگئی اور صبح کی روشنی ماتم کا غبار بن کر ماحول پر چھا گئی پورا ماحول سوگوار ہوگیا۔ اس عظیم رہنما کی موت سے سیاسی

سرگرمیاں سرد پڑنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جس طرح شیر کے نکل جانے سے کچھار سونا پڑ جاتا ہے۔ اسے تقدیر کی بے بسی ہی کہنا چاہیے تلک کی موت سے قوم کی طاقت و توانائی ختم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اٹھ گیا دولت ناموس.....خمار آنکھوں میں

بال گنگا دھر تلک وطن کی عزت و عظمت کا وارث، جہاں فانی سے رخصت ہو گیا۔ شیر دکن، جو وطن پر اپنی جان نثار کرتا تھا جو پیشواؤں کی بخشی ہوئی سرزمین ہند اور ان کے طمطراق اور جاہ و چشم کا وارث تلک اس دنیا میں ہمارے درمیان نہیں رہا، پونا کی بہاریں اور رونقیں اسی کے دم سے باقی تھیں اس دور کے آخری رہنما کی یادیں آنکھوں میں خمار بن کر باقی ہیں۔ اور ہمیشہ وہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

موت مہراشٹ کی تھی.....دو چار گھڑی تاروں کی

تیری موت مہاراشٹر کی موت سے کم نہیں، ماحول سوگوار ہو گیا انسان تیرے غم میں پتھر کے مانند ہو گئے۔ مردنی کا یہ عالم تھا کہ درخت مرجھا گئے پتیوں پر خزاں محسوس ہونے لگی دریاؤں میں روانی ختم ہو گئی، پہاڑوں کی سرسبز و شاداب ہوا تھم گئی اور آسمان میں تاروں کی روشنی بھی ماند پڑ گئی۔ ساری دنیا تیری موت سے غمگین و ناشاد تھی۔

تھا نگہبان وطن.....اب سوئیں گے

اے وطن کے نگہبان، تیرا رعب و دبدبہ عوام و خواص میں مشہور تھا ملک و قوم کی خدمت کے وقت کبھی ترے پاؤں ڈگمگائے نہیں، دشمن بھی ترے نام سے تھرّاتے تھے اور پھر خیال آتے ہی وہ نیند کی حالت میں بھی چونک پڑتے تھے۔ تری موت پر مظلومین وطن آنسو بہائیں گے اور ظالم خوشیاں منائیں گے اور انہیں چین کی نیند میسر آئے گی۔

زندگی تیری.....جوانی تری

ترے وجود سے وطن کے چمن میں بہاریں تھیں تو نے ملک و قوم کی وفاداری کو اپنی آبرو اور عظمت تصور کیا۔ تو وطن کا عاشق صادق تھا۔ تیرا دل وطن کی وفاؤں سے لبریز تھا اور تو نے ہمیشہ وطن سے محبت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ اپنی زندگی وطن کے لیے قربان کر دی اور ہمیشہ کے لیے موت کی آغوش میں چلا گیا۔

اوجِ ہمت پہ رہا.....بڑھاپا تیرا

تیری وفاؤں کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا۔ تیرا جذبۂ حب الوطنی موت کے خوف سے کبھی خائف نہیں رہا۔ قید خانے کا حکم نامہ بھی تیرے لیے فخر وانبساط اور خوشی کا پیغام لے کر آیا۔ قید خانے کی اندھیری کوٹھری میں تو نے اپنی عمر عزیز گزاری اور بالوں کو سفید کر لیا۔ بڑھاپے میں تجھے قید کی صعوبتیں اور فرنگیوں کے ظلم وستم برداشت کرنا پڑے وہ تیرا چہرا آج بھی مری نظروں میں پھر رہا ہے۔

لاش کو تیری.....چِتا تیری

وطن عزیز کے پرانے دشمن تری لاش کو سنوارنے کے لیے ہرگز اس کے قریب نہ آئیں۔ تیرے چہرے کے لیے صندل کی جگہ وطن کی خاک مَلی جائے، شہیدوں کے خون سے جو دامن تر ہے پنجاب کے ستم رسیدہ مظلوم اس کا کفن عطا کریں۔ تیری موت پر آہ وزاری اور ماتم کے بجائے وطن عزیز کے لیے پہنی گئی زنجیروں کی جھنکار سنائی دے بال گنگا دھر تلک کو بھیشم کی طرح تیروں کی چتا درکار ہے۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا

- چکبست کے سوانحی حالات اور تعلیمی زندگی کا علم ہوا۔
- چکبست کی شعری خصوصیات سے واقفیت ہوئی۔
- چکبست کے فکر وفن پر گرفت کا اندازہ ہوا۔
- چکبست کی دو نظموں کی تشریح سمجھ میں آئی۔
- شاعری میں چکبست کے مقام ومرتبے کا اندازہ ہوا۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے۔

1- چکبست کا پورا نام، پیدائش اور وفات بیان کیجیے؟
2- چکبست کی شاعری کی فنی خصوصیات مختصراً بیان کیجیے؟
3- چکبست کی شناخت کس صنف شاعری سے ہے؟
4- نظم ''راماین کا ایک سین'' میں چکبست نے کیا پیغام دیا ہے؟
5- چکبست ان کا تخلص تھا یا خاندانی نام وضاحت کیجیے؟

10.6 سوالات کے جوابات

1- چکبست کا پورا نام برج نراین ہے۔ پیدائش 9/جنوری 1882 میں فیض آباد کے ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی۔ اور وفات 12/فروری 1926 کو ہوئی، لکھنو میں آخری رسومات ادا کی گئیں۔

2- حب الوطنی اور جذبات کی مرقع کشی چکبست کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ چکبست کے کلام میں منظر کشی، تشبیہات واشعار کے سوز وگداز، رمز وایماء، پیکر تراشی، مزاح نگاری اور عشقیہ شاعری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ چکبست نے نظم وغزل کے علاوہ شخصی مرثیے بھی کہے۔ حب الوطنی، قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ صبح وطن کے عنوان سے چکبست کا پہلا شعری مجموعہ شایع ہوا چکبست کے یہاں سماجی، اصلاحی اور مذہبی نوعیت کی نظمیں ملتی ہیں۔ کشمیری اور لکھنوی تہذیب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ راماین کا ایک سین، 'مرثیہ گوبال گنگا دھر تلک' اور 'حب قومی' چکبست کی مشہور نظمیں ہیں۔

3- چکبست نے نظم وغزل دونوں ہی اصناف میں طبع آزمائی کی اور چند شخصی مرثیے بھی کہے۔ لیکن چکبست بنیادی طور پر نظم ہی کے شاعر ہیں اور اسی صنف میں ان کی شناخت بھی ہے۔ حب الوطنی، قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ان کے اہم اور بنیادی موضوعات تھے۔

4- نظم راماین کا ایک سین، میں چکبست نے رام چندر جی کے رخصت ہوتے وقت کا نہایت پر سوز منظر بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ والدین کا احترام، قول کا پاس، قربانی و ایثار اور اعلیٰ کردار کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے اور دامان دشت کو دامن مادر کے مصداق تصور کیا ہے۔

5- چک زمین کے ایک طویل وعریض ٹکڑے کو کہتے ہیں ان زمینوں پر چکوں کو آباد کرنے کے لیے جو زمین زمینداروں کو دی جاتی تھی اور اس پر جو افسر تعینات ہوتے تھے ان کو چکبست کہتے تھے بلکہ اس عہدے کا نام ہی چکبست تھا۔ لکھنؤ کے مہاجر پنڈتوں میں چکبست نام کا ایک خاندان موجود ہے اس طرح چکبست ان کا خاندانی نام بھی تھا اور تخلص بھی۔

10.7 فرہنگ

لفظ	معنی
ماتم	سوگ
غبار	خاک آلود
کچھار	شیر کے رہنے کی جگہ
معرکہ	میدان جنگ
خمار	نشہ
شاداب	تروتازہ
صحرا	جنگل
کہسار	پہاڑ
دبدبہ	رعب
رقیب	دشمن
اوج	بلندی
راحت	سیرابی
نوید	خوشی
زنداں	قید خانہ
قید ستم	قید کی صعوبتیں
جذبۂ قوم	قوم کا جوش
جبیں	پیشانی
صندل	ایک قسم کی خوشبودار لکڑی

راہ وفا	عہد و پیماں کی منزل
رخصت	وداع ہونا، جُدا ہونا
زیارت	دیدار
نونہال	جواں سال
خستہ حال	مرجھایا ہوا، بدحال
شدت ملال	بہت زیادہ غم
دیدۂ حسرت	حسرت کی نگاہ سے دیکھنا
جنبش	حرکت
گوشہ ہائے چشم	آنکھ بھر کر دیکھنا
تیغ تیز	تیز دھار والی تلوار
اشک ریز	آنسو ٹپکنا
ناشاد	ناخوش
شاق	مشکل
عالم پیری	بڑھاپے کا دور
شادکام	خوش وخرم
کرم کارساز	جو کام بنانے والا ہے
حضر	وطن میں قیام
دامان دشت	جنگل
دامان مادر	ماں کی گود

10.8 کتب برائے مطالعہ

1- چکبست! حیات وادبی خدمات — افضال احمد — سرفراز قومی پریس، لکھنو، 1975

2- معرکہ چکبست وشرر — مرتب محمد شفیع شیرازی — نسیم بک ڈپو، لکھنو، 1962

3- چکبست اور باقیات چکبست — کالیداس گپتا رضا — ول پبلیکشنز، بمبئی، 1979

4- غزلیات چکبست کا فکری وفنی مطالعہ — سنجے کمار — ادارۂ نیا سفر، الہ آباد، 2011

5- چکبست — سرسوتی سرن کیف — ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1988

6- صبح وطن: مجموعہ کلام — چکبست — نامی پریس، لکھنو، 1985

7- کلیات چکبست — کالیداس گپتا رضا — ول پبلیکشنز، بمبئی، 1979

8- مضامین چکبست — چکبست — انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد، 1937

9- نیرنگ دہلی (چکبست نمبر) — مارچ 1932

اکائی 11 علامہ اقبال کی نظم نگاری اور ان کی منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 علامہ اقبال کی نظم نگاری

11.3.1 علامہ اقبال کا مختصر تعارف

11.3.2 علامہ اقبال کی شاعری کی خصوصیات

11.3.3 علامہ اقبال کی فکر وفن میں انفرادیت

11.3.4 دو منتخب نظموں کی تشریحات

I خضرِ راہ

II نیا شوالہ

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالات کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقف ہوں گے
- علامہ اقبال کے فکر وفن کو سمجھ سکیں گے
- علامہ اقبال کی نظموں کے امتیازات جان سکیں گے
- علامہ اقبال کی نظموں میں انفرادیت کا تعین کر سکیں گے
- علامہ اقبال کی نظم نگاری کی روایت سے متعارف ہوں گے
- علامہ اقبال کی نظم 'خضرِ راہ' اور 'نیا شوالہ' کے جملہ پہلوؤں کو جان سکیں گے

11.2 تمہید

آفاقی حیثیت کے حامل علامہ اقبال ایک بلند پایہ شاعر و مفکر تھے۔ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد کشمیری برہمن تھے جس کا ذکر خود علامہ اقبال نے بارہا کیا۔ محمد اقبال نے ایک دیندار اور مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی انداز میں غزل گوئی سے کیا۔ مشہورِ زمانہ استاد داغ دہلوی سے بذریعے خط و کتابت اصلاح لینا شروع کی لیکن کچھ ہی غزلوں کی اصلاح کے بعد داغ دہلوی نے کہا کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی شناخت اور شہرت کے ضامن اُردو شاعری کے چار ایسے مجموعۂ کلام ہیں جس میں انھوں نے خودی، بے خودی، عشقِ حیات اور حرکت و عمل جیسے بہت سے فلسفیانہ نظریات پیش کیے۔ اسی طرح فنّی سطح پر بھی غزل میں نئے موضوعات، لفظیات، تراکیب، علائم، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا اس قدر اضافہ کیا کہ اُردو شاعری عالمی سطح پر اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوگئی اور آج بھی بہت سے ممالک میں محمد اقبال کی وجہ سے اُردو شاعری پڑھی اور پسند کی جاتی ہے۔ اردو کے دیگر شعرا کی طرح انھوں نے بھی ابتدائی دَور میں داغ اور غالب وغیرہ کے رنگ میں شاعری کی مگر بہت جلد ان کا ذہن مقصدیت کی طرف مائل ہوگیا اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ امن و آشتی، اتحاد و اتفاق اور قوتِ فکر و عمل کا پیغام دینا شروع کیا۔ ہم اس اِکائی میں محمد اقبال کے حیات و کارنامے کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا مختصر جائزہ اور دو نظموں (خضرِ راہ اور نیا شوالہ) کی تشریحات پیش کریں گے۔

11.3 علامہ اقبال کی نظم نگاری

11.3.1 علامہ اقبال کا مختصر تعارف

اقبال کا پورا نام شیخ محمد اقبال اور تخلص اقبال تھا۔ ان کا تعلق ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھا۔ جو اٹھارہویں صدی کے شروع میں مشرف بہ اسلام ہوا اور اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوگیا تھا۔ شیخ نور محمد اور امام بی بی کے دوسرے بیٹے محمد اقبال 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش میں کچھ اختلافات ضرور ہیں لیکن محققین کی اکثریت کا اسی تاریخ اور سنہ پر اتفاق ہے۔ محمد اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ انھوں نے مکتب میں قرآن مجید کا ناظرہ مکمل کیا اور فارسی کی روایتی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سید شاہ میر حسن کے مکتب میں داخلہ لیا اور ان سے اردو، عربی اور فارسی زبان و ادب کی تعلیم حاصل کی۔ اقبال کی تخلیقی

صلاحیتوں کو ابھارنے میں میر حسن کا بڑا اہم رول ہے۔ 1891 میں مڈل اور 1893 میں انھوں نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان ممتاز نمبروں سے پاس کیا۔ 1897 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بی۔اے میں انگریزی لازمی کے ساتھ فلسفہ اور عربی ان کے اختیاری مضامین تھے۔ اس دوران فلسفے کے مشہور پروفیسر، ٹامس آرنلڈ علی گڑھ سے گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے تھے اور محمد اقبال کو ان سے پڑھنے کا موقع ملا۔ 1899 میں انھوں نے ایم۔اے کیا اور فلسفہ ان کا سبجکٹ رہا۔ ایم۔اے مکمل کرتے ہی اورینٹل کالج لاہور میں بطور میکلوڈ عربک ریڈر کے ان کا تقرر ہو گیا۔ مئی 1903 تک وہ اورینٹل کالج میں تحقیق و تصنیف، درس و تدریس اور عربی و اردو مطبوعات کو منظّم کرنے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹینٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ستمبر 1905 میں تین سال کی خصوصی رخصت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ چلے گئے۔ اس سفر سے قبل 1903 میں انھوں نے معاشیات کے موضوع پر 'علم الاقتصاد' کے نام سے کتاب لکھی۔ معاشیات کے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا۔۔ 1907 میں جرمنی کے میونخ یونیورسٹی سے 'ایران میں علم مابعد الطبیعات کے ارتقا' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ لکھا۔ ایک سال کے بعد ہی 1908 میں کیمبرج یونیورسٹی کے لنکزان سے بارایٹ لا کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال 27 جولائی 1908 کو وطن واپس ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھارہ ماہ تک بیرسٹری و پروفیسری کے فرائض انجام دیئے۔ 1910 میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ 1914 میں والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کے انتقال پر اقبال نے 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے عنوان سے ایک خوبصورت مرثیہ بھی لکھا۔ 1915 میں 'اسرارِ خودی' کی اشاعت ہوئی۔ یکم جنوری 1923 کو حکومت برطانیہ کی طرف سے 'سر' کا خطاب ملا۔ یوں تو علامہ اقبال کو شروع ہی سے ہندوستان کی عملی سیاست میں دلچسپی تھی مگر 1926 میں لجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔ جنوری 1929 میں مدراس میں اسلامیات کے موضوع پر لکچر دیا، پھر میسور، حیدرآباد، علی گڑھ یونیورسٹیوں میں ان کا لکچر ہوا۔ 17 اگست 1930 میں والد کا انتقال ہو گیا۔ 29 دسمبر 1930 میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسۂ عام کی صدارت کی۔ 7 اکتوبر 1931 کو دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کی۔ 29 نومبر 1931 میں اٹلی کے مشہور ڈکٹیٹر مسولینی سے ملاقات کی۔ 6 دسمبر 1931 کو فلسطین میں ورلڈ مسلم کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی۔ دسمبر 1932 میں تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے پھر انگلستان کا سفر کیا۔ اسی سفر میں

پروفیسر برگساں سے ملاقات ہوئی۔ پھر یہاں سے اسپین کا سفر کیا۔ مسجد قرطبہ میں نفل پڑھی۔ ہسپانیہ میں قدیم اسلامی آثار اور خصوصاً مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال بے حد متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کی شان وشوکت کے آثار نے دل ودماغ پر ایک کیفیت طاری کر دی۔ ان کیفیات کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ''مسجدِ قرطبہ'' میں کیا۔ 1932 میں نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کا سفر کیا۔ 4 دسمبر 1933 کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے 'ڈی لٹ' کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ اس کے بعد 23 دسمبر 1934 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف سے بھی 'ڈی لٹ' کی اعزازی ڈگری تفویض ہوئی۔ الہ آباد یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد نے بھی 1937 میں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔ 1935 میں بغرض علاج بھوپال کا سفر کیا۔ 1931 میں جامعہ ازہر مصر کے علما سے ملاقات کی۔ یکم جنوری 1938 کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے تقریر کی۔ جنوری 1938 میں ہی پورے ہندوستان میں یومِ اقبال منایا گیا۔ ان کو حکیم الامت اور شاعرِ مشرق کے لقب سے بھی یاد کیا گیا۔ جنوری 1938 میں پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی صحت اب خراب رہنے لگی تھی اور علالت کا سلسلہ شروع ہوا بالآخر گلے کے سرطان (Cancer) کے سبب 21 اپریل 1938 کو علامہ اقبال نے اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ انکی پہلی بیوی کے دو بیٹے آفتاب اقبال اور جاوید اقبال اور دوسری بیوی سے ایک بیٹی منیرہ پیدا ہوئیں۔ اقبال نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی۔ ان کا پیغام عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد ہے۔

اقبال کا عہد اور معاصرین:

اقبال نے جب آنکھیں کھولیں تو وطنِ عزیز پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریز یہاں کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ انگریزوں کے ظلم وستم سے لوگ پریشان تھے اور دہشت کی وجہ سے ان کے خلاف کچھ کہنا مشکل تھا مگر بغاوت کی زیریں لہریں موجود تھیں اور وقت کے ساتھ مستحکم ہوتی گئیں۔ اقبال بھی ان حالات سے متاثر تھے اور بنیادی طور پر شاعر ہونے کی وجہ سے اپنا غم وغصّہ شاعری کے پیرائے میں ظاہر کرتے رہے۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت ایک محبّ وطن اور مصلح کی تھی جو ملک کے نوجوانوں میں ذہنی بیداری پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اقبال کے زمانے کے ادبی منظر نامے میں شعراء اور ادبا کی ایک لمبی فہرست تھی جن کے دم سے اس دور کی محفلیں جگمگا رہی تھیں چند نام اس طرح ہیں اکبر الہ آبادی، صفی لکھنوی، نادر کاکوری، وحید الدین سلیم، مولانا ظفر علی خاں، شیخ عبدالقادر، آغا حشر

کاشمیری، فانی بدایونی، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سیماب اکبر آبادی، خواجہ حسن نظامی، پنڈت برج نارائن چکبست، اصغر گونڈوی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری اور جمیل مظہری وغیرہ۔

اقبال کی شاعری کے ادوار:

اقبال کی شاعری کو مطالعہ کے لیے چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا دور ابتداء سے 1905 تک ہے۔ دوسرا دور 1906 سے 1908 تک اور تیسرا 1909 سے 1938 تک سمجھا جاتا ہے

پہلا دور

اقبال نے شاعری کی ابتداء اپنی مادری زبان پنجابی میں کی لیکن بہت جلد اپنے استاد مولوی میر حسن کے مشورے سے اردو میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے سیالکوٹ سے لاہور پہونچے تو انجمن حمایت اسلام کے تحت منعقد ہونے والے مشاعروں نے ان کی شاعری کی نشونما میں اہم کردار ادا کیا اور خاصے بہتر اشعار کہنے لگے۔ 1899 میں اقبال نے اپنی مشہور نظم نالۂ یتیم انجمن کے جلسے ہی میں پڑھ کر سنائی جسے بے حد سراہا گیا اور یہ شعر تو یادگار ہو گیا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ادبی حلقوں کی بے تحاشہ پذیرائی سے حوصلہ کر اقبال بہتری کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ اقبال کے پہلے دور کی شاعری پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شروع میں اقبال بڑی حد تک غزل گوئی کی طرف مائل تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے مشہور زمانہ استاد نواب مرزا خاں داغ سے رجوع کیا اور مراسلتی شاگردی اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی متعدد غزلوں میں داغ دہلوی کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ جیسے:

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا — تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

لیکن شاگردی کا یہ سلسلہ بہت جلد اس وقت ختم ہو گیا جب داغ نے خود اقبال کو لکھا کہ اب آپ کے کلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اصلاحِ کلام کا سلسلہ بھلے ہی ختم ہو گیا مگر اقبال نے داغ

دہلوی کا ہمیشہ احترام کیا اور عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ چنانچہ داغ کی وفات پر اقبال نے 'مرثیہ داغ'' لکھ کر حقِ شاگردی ادا کیا۔ اقبال کی نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز اگرچہ 'نالۂ یتیم' سے ہو گیا تھا مگر یہ نظم ان کے کسی شعری مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ان کی پہلی مطبوعہ نظم 'ہمالہ' ہے جو مخزن کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ مخزن کے تقریباً ہر شمارے کے لیے ایک نظم لکھتے رہے۔ یہ ان کی شاعری کا ارتقائی دور تھا۔ اس زمانے کی غزلوں میں عشق مجازی کی آمیزش اور متصوفانہ مضامین کی جھلک ملتی ہے۔ اسی طرح ان کی نظموں میں کہیں کہیں انگریزی شاعری کا شائبہ بھی نظر آجاتا ہے۔ اس زمانے کی تخلیقات میں مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی عکاسی بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ مثلاً گل رنگین، ابر کہسار، آفتاب صبح، کنارے راوی وغیرہ وغیرہ۔ اس دور میں اقبال وطنیت اور متحدہ قومیت کے دل دادہ تھے۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ اور ترانہ ہندی اس زمانے کی یادگار نظمیں ہیں۔ اقبال کی اس دور کی نظموں میں مظاہر فطرت، مناظر قدرت اور وطنیت کے علاوہ تلاش، تحقیق اور تجسس کا رنگ بھی نمایاں ہے بطورِ مثال یہ شعر ملاحظہ ہو:

مطمئن ہے تو، پریشاں مثل بو رہتا ہوں میں
زخمی شمشیر ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

اس دور میں ان کی کچھ فلسفیانہ خیالات کی حامل نظموں کے ساتھ ساتھ بعض بہت عمیق اور سنجیدہ نظمیں بھی ملتی ہیں۔ شمع، زہد اور رندی اور رخصت اے بزمِ جہاں وغیرہ جس کی واضح مثال ہیں گویا دورِ اول کی شاعری میں اقبال کے مطالعے و مشاہدے کی روشنی میں داخلی جذبات و احساسات، مناظر فطرت کی پیش کش اور روایتی تصوف کی آمیزش کے ساتھ ساتھ پیرایۂ بیان کا تنوع اور اچھوتا پن صاف نظر آتا ہے۔ نظم جگنو اور نیا شوالہ وغیرہ اس کی مثال ہیں۔ بطور مثال یہ شعر ملاحظہ ہو:

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

دوسرا دور:

1905 سے 1908 کا زمانہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ہے اور اسے ارتقائی دور کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے سفرِ یوروپ کے بعد اقبال کی فکر میں واضح تبدیلی آئی۔ ان کی شاعری کا رخ بھی بدل گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قیام یورپ کے دوران اقبال نے شاعری سے کنارہ کشی کا ارادہ کر لیا تھا

لیکن بعض اساتذہ اور دوستوں کے کہنے پر دوبارہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اسی دوران ایک تغیر یہ بھی ہوا کہ اقبال فارسی کی طرف مائل ہوئے اور کچھ لازوال نظمیں کہیں۔ قیام یورپ ہی کے زمانے میں اقبال کے تصور وطنیت میں تبدیلی آئی۔ اب وہ کہنے لگے کہ مجھے اندیشہ ہے کہیں ملتِ اسلامیہ بھی انگریزوں کی تقلید میں ان کے محدود نیشنلزم کے تصور کا شکار نہ ہو جائے۔ اس جذبے کا اظہار ان کی نظم 'انسان' اور 'شیخ عبدالقادر کے نام' میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے اس دور کی شاعری میں مناظر فطرت کی جگہ معاشرتی مسائل اور سیاسی معاملات نے لے لی تھیں۔ اب ان کی شاعری میں یقین اور پیغام کا رنگ غالب ہونے لگا اور انھیں شاعر کے بجائے پیامبر کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ مثلاً طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام میں وہ کہتے ہیں:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مندوں کا طرز کلام اور ہے

اس دور کی نظموں کا وصفِ خاص یہ بھی ہے کہ ان میں فلسفۂ خودی کے عناصر اپنی ابتدائی شکل میں ظہور پذیر ہونے لگے تھے۔ اس زمانے کی زیادہ تر نظموں کا رخ مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس میں افکار و خیالات کی وسعت و گہرائی اور اسلوب میں تنوع موجود ہے۔

تیسرا دور:

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے، احیاء ملت کا جذبہ اگرچہ اقبال کے یہاں شروع سے موجود تھا لیکن قیام یورپ کے دوران اس میں شدت پیدا ہوئی اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ بقیہ ساری عمر شاعری سے یہی کام لیا جائے۔ 1908 کے بعد کی اقبال کی شاعری میں بہ کثرت فلسفیانہ افکار اور حکیمانہ مضامین کی وجہ یہی ہے کیوں کہ اسی زمانے میں مغربی قوتوں میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے لیے جس طرح کی سازشوں میں شدت آئی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اقبال نے انگریزوں کی ان پالیسیوں کے خلاف بہت ہی شد و مد کے ساتھ احتجاج کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے اس تہذیب کی حقیقت کو واضح کیا۔ اقبال نے نظم اسرار خودی اور بے خودی لکھ کر نوجوانوں کے دلوں کو گرمانے اور اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی ترغیب دی جس کے بہت سے مثبت نتائج سامنے آئے۔ خودی اور عشق کا فلسفہ پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آیا۔ جس کی واضح مثال نظم 'مسجد قرطبہ' اور 'ساقی نامہ' ہیں۔

اس دور کی اکثر نظموں میں اقبال نے مسلمانوں کے قلبی جذبات کی ترجمانی کی اور ان کے احساسِ کمتری کو ختم کرنے کے لیے انھیں ماضی کی عظمتِ رفتہ کے واقعات سنائے اور ان کے احساسِ خودی کو اُبھارنے کی کوشش کی۔ خیالات کے ساتھ ساتھ زبان واسلوب خاصا مستحکم ہے۔ فلسفیانہ غور وفکر، شاعرانہ طرزِ بیان کے علاوہ محاسنِ شعری کا بہ کثرت استعمال بھی ہے۔ خیالات میں وسعت، احساس وجذبات میں شدت کی مظہر ان کی شاہ کار نظموں شکوہ، جوابِ شکوہ اور شمع وشاعر کو بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری کے مذکورہ تینوں ادوار ان کی فکر وفن کے ارتقا کی داستان ہیں۔ ان کی فکری وسعتوں اور فنی بلندیوں کو سمجھنے میں معاون ومددگار ہیں۔

11.3.2 علامہ اقبال کی شاعری کی خصوصیات

زبان وادب کی تاریخ میں جو مقام ومرتبہ محمد اقبال کو حاصل ہے وہ اردو کے چند ہی شعرا کو میسر ہوا۔ ان کو بیک وقت ایک مفکر، بلند پایہ شاعر، دانشور، جید فلسفی، محبّ وطن، انسان دوست، اور پیامبر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں نئی روح پھونکی۔ اقبال نے فلسفے کی خشکی کو رعنائی اور رنگینی عطا کی۔

اقبال کی شاعری کو بلندی عطا کرنے میں ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا اہم کردار ہے۔ ان کی شاعری اور فلسفے کے بعض اہم عناصر، خودی، عشق، عمل، اور مردِ مومن میں مضمر ہیں۔ انھوں نے انسان کی خودی کو اس کی زندگی کا مرکز قرار دیا۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

محمد اقبال نے خودی کے فلسفے کو اپنی فکر میں مرکزی نقطہ کی حیثیت دی۔ خودی کے تصوّر کو سمجھنے کے بعد ان کی شاعری کی تفہیم آسان ہوجاتی ہے اقبال کی خودی سے مراد خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین ہے۔ جب انسان کی خودی بلند ہوتی ہے تو اس کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ خودی کو بیدار اور باعمل بنانے کے لیے وہ ''عشق'' کو ضروری سمجھتے ہیں اسی لیے عشق ان کے یہاں ایک جذبہ اور قوتِ عمل ہے۔ فلسفۂ خودی کی تشکیل کے دوران اقبال مولانا رومی کے تصورِ عشق سے بہت متاثر نظر آتے ہیں یہی تصور ان کے فلسفہ کا اہم ترین حصہ ہے۔ خودی کی سعی پیہم

اور ارتقا کے دوران جو چیز اسے آگے بڑھاتی ہے وہ یہی تصور ہے۔:

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

محمد اقبال کے عشق کو عقل پر فوقیت دینے کی وجہ اس کا بے خوف ہونا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

وہ کہتے ہیں جب عشق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تو انسان کبھی بھی بیکار اور بے عمل نہیں ہوسکتا اور عمل سے ہی انسان اپنی زندگی کو جنت یا جہنم بناتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

جس میں خودی، عشق اور عمل کے جذبات موجود ہوں وہ مردِ مومن ہے۔ مردِ مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبت ہے اور ان کے نظریۂ خودی کے ارتقا کی آخری کڑی ہے اقبال مردِ مومن کی صفات اور اس کے انفرادی ارتقا کی منازل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ وہ اس معاشرے کی بھی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں جس میں مردِ مومن کی تربیت کے پورے سامان موجود ہوں:

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

محمد اقبال کے خیالات، احساسات اور جذبات بالکل منفرد تھے۔ ان خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے انھوں نے اپنی زبان خود تخلیق کی۔ یعنی اب تک جو الفاظ اردو زبان میں خاص مفہوم کے تحت استعمال ہوتے تھے ان کو الگ اور مختلف مفہوم میں انھوں نے استعمال کیا جیسے خودی یا عشق، شاہین اور مردِ مومن۔ شاہین علامت ہے بلند پرواز کی، استغنا کی، غیرت اور جرأت کی۔ یہ پرندہ اپنا گھونسلہ نہیں بناتا۔ پہاڑوں کی چٹّانوں میں بسیرا کرتا ہے۔ دوسروں کا شکار کیا ہوا نہیں کھاتا۔ اس کی انھیں صفات کے پیشِ نظر اس لفظ کو عام اور معمولی مفہوم میں استعمال نہیں کیا بلکہ خاص طور پر غیر

معمولی مفہوم میں استعمال کیا ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کلامِ اقبال کے الفاظ نہایت شیریں اور سادہ ہوتے ہیں موقع اور صنف کے تقاضے کا بھی انھیں اچھی طرح احساس رہتا ہے۔اس لیے ان کے کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ سادہ اور سبک ہوتے ہیں محاورے اور ضرب الامثال بھی برجستہ ہوتے ہیں۔تراکیب میں زیادہ تر فارسی رنگ غالب رہتا ہے۔منظر نگاری اور محاورات میں وہ اپنے قلم سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مصور اپنی اسکیچ سے لیتا ہے۔:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

اقبال کا بنیادی اسلوب مکالماتی ہے۔تمثیل کا یہ سادہ اور پیچیدہ عمل اختیار کر کے اقبال نے اس پیرایۂ بیان کو بہت وسعت دی ہے۔یہ مکالمہ گائے اور بکری کے درمیان بھی ہوسکتا ہے، پروانہ اور جگنو کے درمیان بھی اور شمع و پروانہ، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور گلہری، مکڑا اور مکھی، عقل و دل سبھی بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔کلامِ اقبال کے موضوعات میں بے حد تنوع ہے اردو میں اتنی کثرت کے ساتھ زندگی و زمانے کے حالات کو اس سے قبل اتنی غیر معمولی فنکاری اور جمالیاتی شعور کے ساتھ کبھی نہیں پیش کیا گیا۔علامہ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے افکار اور فکری سرچشموں کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔قرآن اور حدیث کے علاوہ ان کی فکر کے تین سرچشمے ہیں:

1۔ مسلمان حکما اور صوفیا، جن میں شیخ احمد سرہندی فاروقی مجدد الف ثانی اور جلال الدین رومی وغیرہ شامل ہیں۔

2۔ دوسرا سرچشمہ، مغربی مفکرین کا ہے، جن میں گوئٹے، دانتے، نطشے، برگساں اور دیگر شعرا و حکما شامل ہیں۔

3۔ تیسرے سرچشمے میں قدیم ہندو مفکرین و شعرا کو شامل کیا جاتا ہے جن میں اہم نام بھرتری ہری، کالیداس اور رام وغیرہ کا ہے بلکہ اقبال نے بال جبریل جیسی معرکتہ الآرا تصنیف کا

عنوان بھرتری ہری کے فلسفے سے ہی ماخوذ کیا ہے:

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اقبال نے حب الوطنی کے متعلق جو اشعار کہے ہیں ان میں اس قدر غنائیت، سلاست، روانی اور تخیل کی پرواز ملتی ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

11.3.4 منتخب نظموں کی تشریحات

I خضرِ راہ

شاعر پہلا بند

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصورِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب
رات کے افسوں میں طائر آشیانوں میں اسیر — انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر — جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل — چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

دوسرا بند

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار — جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم — علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد　　زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے　　اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک　　نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محروم آبِ زندگی　　فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفیٰ　　خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تیسرا بند:　　جوابِ خضر (صحرانوردی)

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل
ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل
وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بینِ خلیل
اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش

اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل
پختہ تر ہے گردش پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

چوتھا بند

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہوجائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

پانچواں بند:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوت پنہاں کو کردے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثال آفتاب
تابدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

چھٹا بند: سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمز آئیہ اِنَّ الملُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری
خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
از غلامی فطرت آزاد را رسوا ممکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری!
گرمئی گفتارِ اعضائے مجالس الا ماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری!
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

ساتواں بند: **سرمایۂ ومحنت**

بندۂ مزدور کو جاکر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر!
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات!
دستِ دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات!
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب رنگ
''خواجگی'' نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ے ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سُکر کی لذت میں تولٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!

آٹھواں بند:

ہمت ِعالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک!
نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!
توڑ ڈالیں فطرت ِانساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشم آدم کب تلک
باغباں چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیر مرہم کب تلک؟

کرمِک ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو!

نواں بند دنیائے اسلام

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ!
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز!
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستاں سے پارس
وہ مئے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند؟

دسواں بند:

مُلک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں
حق ترا چشمے عطا کر دست غافل در نگر!
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر

ربط و ضبط ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر!
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابئ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاک رہگذر!
تا خلافت کی بِنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر
اے کے نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابو بکرؓ و علیؓ ہوشیار باش!

گیارہواں بند:

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہوچکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ!
تونے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج
موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
عام حرّیت کا دیکھا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ!

اپنی خاکستر سمندر کو ہے سامانِ وجود
مر کے پھر ہوتا ہے پیدا یہ جہان پیر دیکھ!
کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ!
مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لایُخلِفُ المِیعَاد دار

تشریح

اقبال نے یہ نظم 1921 و1922 کے درمیان لکھی۔ اس کا شمار ان کی عظیم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ نظم بھی انھوں نے اپنی دیگر مشہور نظموں شکوہ، جواب شکوہ اور شمع وشاعر وغیرہ کی طرح انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ 1923 میں خود پڑھ کر سنائی تھی۔ ان کی یہ نظم سوز واثر میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ اس کو پڑھتے وقت خود علامہ اقبال پر کافی رِقّت طاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال نظم نہیں بلکہ کوئی مرثیہ پڑھ رہے ہیں اور جب اقبال نے یہ شعر پڑھا تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا خود اقبال کی روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی:

آگ ہے اولاد ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ عظیم کی خونچکاں داستاں انسانیت کبھی فراموش نہیں کرسکتی اس لئے کہ پورے چار سال تک کروڑوں انسانوں کا ایک دوسرے کو فنا کرنے میں لگے رہنا دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن مسلمان جو ایک لمبے عرصہ سے روبہ زوال تھے اس سانحہ کی تاب نہ لاسکے۔ ترک لڑائی میں شکست کھا گئے۔ پایہ تخت کی شاہراہوں اور گلیوں میں فرانسیسی اور برطانوی سپاہی صرف دندناتے ہی نہیں بلکہ قتل وغارت گری کرتے نظر آئے۔ ایران کی حالت 1908 ہی

میں نازک تھی جنگ عظیم نے اس کو بے جان کر دیا۔ عرب ترکوں سے آزادی پانے کے لئے دشمنوں سے مل گئے لیکن ترکوں کے پنجے سے نکل کر فرانس اور برطانیہ کے چنگل میں گرفتار ہو گئے۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق اور بغداد، غیروں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ مکّہ اور مدینہ بظاہر آزاد تھے لیکن درحقیقت ان پر دشمنوں کے وظیفہ خواروں کا قبضہ تھا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہندوستان میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی اور اہل ہند آزادی حاصل کرنیکے لیے بے قرار ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے یہاں بھی سنگدلی کا مظاہرہ کیا۔ خاص کر اہل پنجاب کو خوب ذلیل کیا اور قسم قسم کے ان پر ظلم وستم ڈھائے۔ جلیانوالہ باغ میں نہتے اور بے گناہ ہندوستانیوں کا خون بے دریغ بہایا۔ قومی تحریک مرجھا رہی تھی، اور بین الاقوامی سطح پر ترکوں کے وجود پر خطرہ مڈلا رہا تھا۔

یہ حالات تھے کہ جن میں اقبال نے ''خضر راہ'' لکھی۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے انسانیت کا جنازہ اُٹھتے، بستیوں کو اجڑتے، ملکوں کو تباہ اور شاہوں کو بے تاج ہوتے، لاکھوں انسانوں کو مرتے، ملکوں اور قوموں کو مٹتے اور آزادوں کو غلام ہوتے دیکھا تھا اور بالخصوص عالم اسلام پر آنے والی تباہی سے ان کا دل بیحد متاثر ہوا تھا۔ ان مضطرب حالات میں اقبال کا سکون غارت ہو جاتا ہے اور پریشانی کے عالم میں سکون کی تلاش میں وہ دریا کے کنارے نکل جاتے ہیں۔ اور ساحلِ دریا کے پرسکون ماحول کی عکاسی سے اس نظم کی ابتدا ہوتی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اس نظم کی ابتدا بڑے انوکھے، شاعرانہ اور خوبصورت انداز میں کی ہے اور نظم کے پہلے بند میں ساحل دریا کی خاموشی کا منظر نہایت مناسب تشبیہوں کی مدد سے متأثر کن انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر — تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مست خواب

چاندنی رات میں ستاروں کا کم کم چمکنا اور پرندوں کا آشیانوں میں چلے جانا اس رات کی خاموشی کو اور بھی مکمل کر دیتا ہے۔

دوسرے بند میں خضر سے گفتگو کے سلسلے میں تین شعروں میں خضر کے کمالات کی تعریف کر دینا اور پھر اس کے بعد اپنے سوالات ان کے سامنے پیش کر دینا جامعیت کا کمال ہے۔

تیسرے بند میں خضر اپنی صحرا نوردی کے متعلق جو جواب دیتے ہیں وہ اقبال کی فنکاری کو ظاہر کرتا

ہے اور ان کی فلسفیت کو اور مذہب سے بصیرت کو بھی۔ان کے یہ دو اشعار ان کے تخیل اور محاکاتی فنکاری کو ظاہر کرتے ہیں۔

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگام صبح　　یا نمایاں بامِ گردوں سے جبین جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب　　جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بینِ خلیل

چوتھے و پانچویں بند میں اقبال نے خضر کی زبانی زندگی کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ زندگی بذات خود ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے البتہ استحکام اور ارتقا کے لئے انسان کو خود جدو جہد کرنا پڑتی ہے اور زمین و آسمان پر چھا جانے کے لیے اپنے قلوب میں ایسی ہمت پیدا کرنی پڑتی ہے جو آسمان اور ستاروں کو بھی قابو میں کرلے۔اگر انسان نے یہ نہ کیا تو اس کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہے یعنی پھر اس کے لئے فنا یقینی ہے۔

چھٹے بند میں اقبال نے فرنگی قوموں کے طرز حکومت کی چالبازیوں کا پول کھولا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح یہ فرنگی حکومتیں جمہوریت کے پردے میں اپنی نوآبادیوں پر مظالم ڈھاتی رہتی ہیں۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ساتویں بند میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کی کش مکش پر اقبال نے خضر کی زبانی نہایت بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سرمایہ دار کس طرح مزدوروں کی محنت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہتے ہیں اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے خود عیش کرتے ہیں اور ان کو مجبور و بیکس بنائے رکھتے ہیں۔

نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

آٹھویں بند میں اقبال مزدوروں اور غریبوں کو جوش و ولولہ دلاتے ہیں کہ اٹھو اور اس سرمایہ داری سے

بھری ہوئی دنیا میں انقلاب برپا کر دو کیونکہ اب غریبوں اور مزدوروں کے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

آخری تین بندوں میں اقبال نے خضر کی زبانی دنیائے اسلام پر بڑی فکر انگیز نظر ڈالی ہے اور حالات کا صحیح تجزیہ کیا ہے یعنی بتایا ہے کہ کس طرح فرنگیوں نے اپنی چالاکیوں اور سیاست سے ترکوں کی خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور ہر جگہ مسلمان تباہ و برباد ہو گیا۔ لیکن اس تباہی اور بربادی سے اقبال ناامید نہیں ہیں چونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نئی عمارت بنانے کے لئے پرانی عمارت کو تباہ کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمان آپس میں ربط وضبط اور تنظیم پیدا کریں اور حرم کی پاسبانی کے لیے مشرق سے لے کر مغرب تک تمام اسلامی ممالک ایک ہو جائیں۔ اقبال یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے اس امت کو بالآخر سربلندی دینے کا وعدہ کیا ہے اسی لئے اگر پھر سے منظّم ہو جائے اور اپنی حالت سدھارے تو خدا کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔

آخر کار خضر کی پیشن گوئی پوری ہوئی۔ ایک برس بھی نہ گذرا تھا کہ ترک موت کے پنجے سے نجات پا گئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں سے ملک کو نجات دلائی۔ قسطنطنیہ پر پھر اسلامی پرچم لہراتا نظر آیا ایران کو رضا شاہ پہلوی نے بچا لیا اور روسی وانگریز دونوں اپنے اپنے حلقہ اثر سے دست بردار ہو گئے۔ شام، عراق و فلسطین میں عربوں کی آزادی کی جنگ شروع ہو گئی۔

مختصر یہ کہ اقبال کی یہ نظم سیاست، مذہب اور فلسفیانہ مسائل کو پیش کرتی ہے خصوصاً اس وقت جبکہ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی لیکن جس بلند آہنگی اور جلال و جمال کے ساتھ ان خیالات کو اقبال نے شاعرانہ روپ دیا ہے اسکی مثال نہیں ملتی۔ ایسے سنجیدہ مضامین اگر شعر میں بیان کئے جاتے ہیں تو عموماً خشک خطابت بن کر رہ جاتے ہیں یا پند و نصائح کے دفتر لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر بند میں شعریت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔

II نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا　　جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا　　واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتّھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرّہ دیو تا ہے

آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھا دیں　　بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی　　آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

تشریح

'بانگِ درا' میں شامل علامہ اقبال کی یہ مشہور نظم 'مخزن'، لاہور میں 1905 میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ علامہ اقبال کی اس نظم کو سمجھنے کے لیے ان کی 1905 سے 1908 تک کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ وہ دور تھا جب علامہ اقبال حبّ الوطنی اور قومی یکجہتی و اتحاد کا پرچار اپنی شاعری کے ذریعے اس بلند آہنگی سے کر رہے تھے کہ نہ صرف ملک کے ذی شعور افراد بلکہ ہندوستانی عوام، سبھی حب الوطنی کے جذبے کی کسک اپنے دلوں میں محسوس کرنے لگے تھے۔

علامہ اقبال کے اس دور کی مشہور نظموں میں ہمالہ، پرندے کی فریاد، صدائے درد، تصویرِ درد، ترانہ ہندی اور ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت قابلِ ذکر ہیں لیکن ان کی اس قومی و وطنی شاعری کا نقطۂ عروج ان کی نظم 'نیا شوالہ' ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی سیاست کے مشہور ایک قومی نظریہ کا نہایت واضح تصور پیش کیا جو کہ اس دور میں ایک اچھوتا خیال تھا اور جس کو آگے چل کر آزادی کے متوالے اور صاحب فکر رہنماؤں نے استحکام بخشا۔ ہندوستانی قومیت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس سرزمین پر

بسنے والی جماعتوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ازل سے اس کا باشندہ رہا ہو۔ مختلف تاریخی اور سماجی محرکات کے زیر اثر مختلف زمانوں میں مختلف قومیں ہندوستان آئیں اور یہیں کی ہو کر رہ گئیں اور سر زمینِ ہند نے انھیں ہمیشہ کے لیے اپنا لیا۔ علامہ اقبال نے اس نظم میں اسی اخوت اور وطن پرستی کو ایک موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم دو بندوں پر مشتمل ہے پہلے بند میں چار اشعار ہیں جبکہ دوسرے میں پانچ اشعار ہیں۔ دونوں بندوں کی تشریح ملاحظہ ہو۔

علامہ اقبال ایک برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تُو بُرا نہ مانے تو میں حقیقت کا اظہار کروں ہر چند کہ یہ حقیقت قدرے تلخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو جن بُتوں کی عبادت کرتا ہے وہ انتہائی پُرانے یعنی فرسودہ ہو چکے ہیں اور زمانہ حال میں ان کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے انہی بتوں کی عبادت نے تجھے اپنے جیسے انسانوں سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔ اے برہمن! صرف تو ہی اس لعنت میں مبتلا نہیں ہے بلکہ واعظ بھی اس طرح کی تفرقہ بازی اور جنگ و جدل میں مصروف ہے۔ اسی لیے میں نے اس صورتِ حال سے تنگ آ کر کعبہ و بت خانہ دونوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اے برہمن! تیرا عقیدہ محض یہ ہے کہ پتھر کی ان بے جان مورتیوں میں خدا کا وجود پوشیدہ ہے۔ جب کہ میں اپنے وطن کی خاک کے ہر ذرّے کو دیوتا تصّور کرتا ہوں اور اس پر جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

اے برہمن! آ، ہم دونوں مل کر ایک بار پھر نفاق اور تفرقہ بازی کا خاتمہ کر دیں اور اہلِ وطن جو باہمی نفرت اور نفاق کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے درمیان اتفاق اور اتحاد کا جذبہ پیدا کر کے ایک بار پھر گلے ملا دیں۔ اسی نفاق کے سبب دلوں کی بستیاں ویران ہو چکی ہیں۔ آ، ان لوگوں میں ایک نئے شِوالہ (نئے مندر) کی بنیاد رکھ دیں۔ یہ شوالہ ساری دنیا کی عبادت گاہوں سے مرتبے میں بلند و بالا ہو۔ اس شوالہ میں سب محبت و آشتی کے نغمات گائیں اور تمام اہلِ ہند میں محبت و اخوت کی فضا پیدا کریں۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

- اقبال کے سوانحی خاکہ اور تعلیمی زندگی سے واقفیت حاصل ہوئی۔
- اقبال کی شاعری کی خصوصیات کا علم ہوا۔
- اقبال کے فکر و فن کا اندازہ ہوا۔
- اقبال کی دو نظموں کی تشریح اور تجزیہ سامنے آیا۔
- شاعری میں اقبال کے مقام و مرتبے کا تعین ہو سکا۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ اقبال کا پورا نام، تاریخِ پیدائش اور وفات بیان کیجیے؟

2۔ اقبال کی شاعری کی خصوصیات مختصراً بیان کیجیے؟

3۔ نظم ''خضرِ راہ'' کا پس منظر مختصراً بیان کیجیے؟

4۔ اقبال نے شاعری کی ابتدا کس صنف اور کس رنگ میں کی؟

5۔ نظم خضر راہ کے اِس شعر کی تشریح کیجیے؟

کشتیٔ مسکیں و جانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

اور، نیا شوالہ کے درج ذیل بند کی تشریح کیجیے؟

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتّھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

11.6 سوالات کے جوابات

1۔ اقبال کا پورا نام محمد اقبال ہے۔ علامہ اور سر خطابات ہیں۔ 9 نومبر 1877 میں سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے اور 21 اپریل 1938 میں انتقال ہوا۔

2۔ اقبال کی شاعری بہت سی خصوصیات سے مزین ہے۔ انھوں نے جہاں شاعری میں بہت سے نئی لفظیات وعلائم، تراکیب وتشبیہات واستعارات، تلمیحات، محاکات، منظر نگاری اور پیکر تراشی وغیرہ کے نمونے پیش کیے وہیں شاعری کو گل وبلبل اور گیسو ورخسار سے نکال کر خودی، بے خودی، عشق، حرکت وعمل، شعورِ ذات اور حیات وکائنات کے بہت سے فلسفے پیش کیے۔ شاعری کو دنیا کے زندہ اور تاریخی حوالوں سے مزّین کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں صفت نگاری کے بھی نمونے اس قدر ملتے ہیں کہ دیگر شعرا کے یہاں اس کی نظیر

نہیں ملتی۔ انھوں نے تقریباً تمام ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کی زیادہ شہرت نظم کے باب میں ہے۔ ان کے اُردو کے چار مجموعے ہیں: (1) بانگِ درا (2) بالِ جبریل (3) ضربِ کلیم (4) ارمغانِ حجاز۔

3۔ نظم 'خضرِ راہ' کا پس منظر: اقبال نے یہ نظم 1921، 1922 کے درمیان لکھی۔ اس کا شمار ان کی عظیم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ نظم بھی انھوں نے اپنی دیگر مشہور نظموں شکوہ، جواب شکوہ اور شمع و شاعر وغیرہ کی طرح انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ 1923 میں خود پڑھ کر سنائی تھی۔ ان کی یہ نظم سوز و اثر میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ اس کو پڑھتے وقت خود علامہ اقبال پر کافی رِقّت طاری تھی۔ جب اقبال نے یہ شعر پڑھا تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا خود اقبال کی روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی

آگ ہے اولاد ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ عظیم کی خونچکاں داستاں انسانیت کبھی فراموش نہیں کر سکتی اس لئے کہ پورے چار سال تک کروڑوں انسانوں کا ایک دوسرے کو فنا کرنے میں لگے رہنا دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن مسلمان جو ایک لمبے عرصہ سے روبہ زوال تھے اس سانحہ کی تاب نہ لا سکے۔ ترک لڑائی میں شکست کھا گئے۔ ان کا خلیفہ دشمنوں کے ہاتھوں قید و بند کا شکار ہوا۔ پایہ تخت کی شاہراہوں اور گلیوں میں فرانسیسی اور برطانوی سپاہی صرف دندناتے ہی نہیں بلکہ قتل و غارت گری کرتے نظر آئے۔ ایران کی حالت 1908 ہی میں نازک تھی جنگ عظیم نے اس کو بے جان کر دیا۔ عرب ترکوں سے آزادی پانے کے لئے دشمنوں سے مل گئے لیکن ترکوں کے پنجے سے نکل کر فرانس اور برطانیہ کے چنگل میں گرفتار ہو گئے۔ بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق اور بغداد غیروں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ مکّہ اور مدینہ بظاہر آزاد تھے لیکن درحقیقت ان پر دشمنوں کے وظیفہ خواروں کا قبضہ تھا۔

جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہندوستان میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوئی اور اہل ہند آزادی حاصل کرنے کے لیے بیقرار ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے یہاں بھی پوری سنگدلی کا مظاہرہ کیا۔ خاص کر اہل پنجاب کو خوب ذلیل کیا اور قسم قسم کے ان پر ظلم و ستم ڈھائے۔ جلیانوالہ باغ میں نہتے اور بے

گناہ ہندوستانیوں کا خون بے دریغ بہایا اور جب جلیانوالہ باغ کے شرمناک واقعہ سے اہلِ ہند میں بے چینی پھیلی تو ہزاروں ہندوستانی جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ بے چارگی اور بے بسی ظلم وستم کا کیا مقابلہ کرتی۔قومی تحریک مرجھا رہی تھی اور بین الاقوامی سطح پر ترکوں کے وجود پر خطرہ مڈلا رہا تھا۔ یہ حالات تھے کہ جن میں اقبال نے ''خضر راہ'' لکھی۔

4۔ اقبال نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی، چونکہ اس وقت داغ دہلوی استاد شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور تھے، اس لیے ان سے شاعری میں اصلاح بھی لی اور ابتدائی دور میں انہوں نے روایتی انداز کی شاعری، داغ، میر، غالب اور دیگر کلاسیکی شعرا کے رنگ میں شعر کہے۔ان کے ابتدائی دور کی غزل کا بطورِ مثال یہ شعر ملاحظہ ہو:

(موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے)

5۔تشریح

کشتیِ مسکیں وجانِ پاک و دیوارِ یتیم
علمِ موسیٰؑ بھی ہے ترے سامنے حیرت فروش

شاعر کہتا ہے کہ اے خضرؑ میں جانتا ہوں کہ آپ کا علم اتنا وسیع ہے کہ حضرت موسیٰؑ بھی آپ کی برابری نہیں کر سکتے چنانچہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ آپ نے ملاحوں کی کشتی میں سوراخ کیوں کر دیا ایک بے گناہ بچے کی گردن کیوں ماردی اور یتیموں کی گرتی ہوئی دیوار بلا کسی اجرت کے کیوں سنبھال دی؟ واضح رہے کہ اس شعر میں کشتی مسکین، جان پاک اور دیوار یتیم میں تین تلمیحی واقعات کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر قرآن کریم کی سورہ کہف میں ہوا ہے یعنی حضرت موسیٰ کی حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور حضرت موسیٰ نے ان کے ساتھ رہ کر علم سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جناب خضر نے فرمایا آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے جناب موسیٰ کے وعدہ فرمالینے پر دونوں حضرات ایک ساتھ سفر کے لیے نکلے اور مذکورہ بالا تینوں واقعات پیش آئے۔ جب یہ دونوں حضرات سمندر کے کنارے پہنچے اور کشتی میں سوار ہوئے تو خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوراخ کر دیا حضرت موسیٰ یہ دیکھتے ہی بول اٹھے کہ آپ نے کشتی میں سوراخ اس لیے کیا ہے کہ مسافر ڈوب جائیں گے۔مسکین سے اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے اور آگے چلے تو ایک لڑکا ملا جناب خضر نے اسے قتل کر ڈالا حضرت موسیٰ بول اٹھے آپ نے اس بے گناہ کی جان خوامخواہ لی وہ بے گناہ تھا اس نے کسی کی جان نہ لی تھی۔آپ نے یہ

کیسی بری بات کی، جان پاک سے اشارہ اسی واقعے کی طرف ہے پھر آگے بڑھے تو ایک گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ کھانے کا انتظام کردو مگر انھوں نے انکار کردیا۔ اسی گاؤں میں ایک پرانی دیوار گرا چاہتی تھی حضرت خضر نے اس کی مرمت کردی حضرت موسیٰ نے کہا کہ آپ چاہتے تو اس محنت کا کچھ معاوضہ لے لیتے۔ دیوار یتیم سے اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے۔ تیسرے اعتراض کے بعد جناب خضر نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ تم باوجود وعدے کے کسی بات پر صبر نہ کرسکے اس لیے ہمارا تمھارا ساتھ نہیں ہوسکتا اور تینوں اعتراضوں کا معقول جواب دیتے ہوئے حضرت موسیٰ کو اپنے سے علیحدہ کردیا۔ انھوں نے بتایا کہ کشتی میں سوراخ اس لیے کیا تھا کہ ایک ظالم بادشاہ مضبوط کشتیاں بیگار میں پکڑ رہا تھا۔ اگر میں سوراخ نہ کرتا تو وہ اس کشتی کو بھی لے لیتا اور اس طرح چند غریبوں کی روزی کا ذریعہ ختم ہوجاتا۔ لڑکے کو قتل اس لیے کیا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اپنی سرکشی اور کفر سے اپنے والدین کو تکلیف پہنچاتا۔ اب امید ہے کہ خدا ان کو بہتر لڑکا دے گا۔ دیوار اس لیے درست کی کہ وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی ملکیت تھی اور اس کے نیچے خزانہ گڑا ہوا تھا۔ دیوار گر جاتی تو لوگ خزانہ نکال لیتے۔

5۔ تشریح

سچ کہہ دوں اے برہمن　　خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

علامہ اقبال ایک برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تُو بُرا نہ مانے تو میں حقیقت کا اظہار کروں، ہر چند کہ یہ حقیقت قدرے تلخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تو جن بُتوں کی عبادت کرتا ہے وہ انتہائی پُرانے یعنی فرسودہ ہو چکے ہیں اور زمانہ حال میں ان کی حیثیت بے معنی ہو کر رہ گئی ہے انہی بتوں کی عبادت نے تجھے اپنے جیسے انسانوں سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔ اے برہمن! صرف تو ہی اس لعنت میں مبتلا نہیں ہے بلکہ واعظ بھی اس طرح کی تفرقہ بازی اور جنگ وجدل میں مصروف ہے۔ اسی لیے میں نے اس صورتِ حال سے تنگ آکر کعبہ و بت خانہ دونوں کو چھوڑ دیا ہے۔ نہ اب میں واعظ کی بات سنتا ہوں اور نہ ہی تیرے اشلوک سننے پر آمادہ ہوں۔ اے برہمن! تیرا عقیدہ محض یہ ہے کہ پتھر کی ان بے جان مورتیوں میں خدا کا وجود پوشیدہ ہے۔ جب کہ میں اپنے وطن کی خاک کے ہر ذرّے کو دیوتا تصوّر کرتا ہوں اور اس پر جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

11.7 فرہنگ

لفظ	معنی	لفظ	معنی
محو	یکسوئی کے ساتھ	جہاں	دنیا
آشیانہ	گھونسلا	انجم	ستارے
شہید	وہ شخص جو حق پر جان دے	سخن گستر	زبان آور
خاکستر	جلی ہوئی چیز کی بھبوت	قوتِ پنہا	مخفی طاقت
سروری	سرداری	زیبا	شایانِ شان
سازِ کہن	پُرانی چال	مغرب	پچھّم
طبِّ مغرب	مغرب کی دوامیں	گرمئ گفتار	ولولہ انگیز باتیں
نبات	گھاس پات	خواجگی	سربراہی
ملتِ بیضا	مراد ملتِ اسلامیہ	نکتہ	کام کی بات
استوار کرنا	مضبوط کرنا	اسلاف	اجداد
گردوں	آسماں	شوالہ	مندر

11.8 کتب برائے مطالعہ

اقبال سب کے لیے — ڈاکٹر فرمان فتح پوری — شعبۂ تصنیف وتالیف کراچی یونیورسٹی 1978

شرح کلیات اقبال — پروفیسر یوسف سلیم چشتی — اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی 1991

اقبال کامل — ڈاکٹر عبدالسلام ندوی — دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ 2014

روحِ اقبال — یوسف حسین خاں — اقبال اکیڈمی حیدرآباد 1998

کلیاتِ اقبال اُردو — علاّمہ اقبال — مرکز مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی 1997

اقبال کی تیرہ نظمیں — پروفیسر اسلوب احمد انصاری — مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور، 1977

اقبال نئی تشکیل	عزیز احمد	اعتقاد پبلشنگ ہاوس دہلی 1980
اقبال فکر وفن	سید محمد ہاشم	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1989
خِضرِ راہ	شمیم انہونوی	نسیم بک ڈپو لاٹوس روڈ، لکھنو 1973
اقبال: شاعر و مفکر	نورالحسن نقوی	ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ 2000

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 12 جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری اور منتخب نظموں کی تشریحات

ساخت

12.1 اغراض ومقاصد

12.2 تمہید

12.3 جوش ملیح آبادی کا تعارف

12.3.1 جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری

12.3.2 منتخب نظموں کی تشریحات

12.3.3 I البیلی صبح II کسان

12.4 آپ نے کیا سیکھا

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

12.6 سوالات کے جوابات

12.7 فرہنگ

12.8 کتب برائے مطالعہ

12.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی سے آپ

- جوش ملیح آبادی کے بارے میں واقفیت حاصل کرسکیں گے
- جوش کی نظم نگاری کو سمجھ سکیں گے
- جوش کی نظموں میں مستعمل نئی لفظیات اور ان کے برتنے کے طریقۂ کار سے واقف ہوں گے
- اس عہد کے تمام شعری مزاج سے واقفیت حاصل کریں گے
- جوش ملیح آبادی کی نظم البیلی صبح اور کسان کے بارے میں جانکاری حاصل کرسکیں گے

12.2 تمہید

اُردو شاعری میں شبیر حسن جوش ملیح آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ شاعری میں انھوں نے بہت سے اضافے کیے ہیں۔ جہاں ماضی کی عظیم شعری روایات سے استفادہ

کیا ہے۔ وہاں جا بجا روایت شکنی سے بھی کام لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنوع اور رنگا رنگی کا پہلو ان کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جوشؔ کی شاعری عہد شباب کے جذبات، نازک احساسات اور اچھوتے شعری احساسات سے عبارت ہے۔ یہاں قدیم روایات و اقدار سے وفاداری تہہ نشین ہے۔ شاعری میں جذبات و احساسات کی لطافت تو ہے۔ سطحیت اور عامیانہ پن نہیں ہے۔ حزن و ملال، مایوسی اور شکست خوردی نہیں ہے آہنگ کی غزلوں میں ایک خاص سرشاری، بانکپن اور وارفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ کلاسیکی روایات کے پاس ولحاظ کے باجود جوش کی شاعری میں ان کی اپنی آواز سنائی دیتی ہے۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے بعد دوسرے بڑے شاعر جوش ملیح آبادی کا نام نظم نگار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ جوش کے معاصرین میں حفیظ جالندھری، احسان دانش، فراق گورکھپوری، مجاز لکھنوی اور علی سردار جعفری وغیرہ ہیں۔ انھوں نے سماجی، سیاسی اور فطرت کی زندگی اور مظاہرِ حسن پر جتنا لکھا ہے دوسرے کسی شاعر نے اتنا نہیں لکھا۔ جوش نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور رباعیاں بھی مگر ان کی شناخت ایک نظم گو کی حیثیت سے ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

12.3 جوش ملیح آبادی کا تعارف

جوش کی پیدائش 5 دسمبر 1898 کو ملیح آباد کے ایک مشہور محلّہ مرزا گنج میں ہوئی۔ ان کے گھر والوں نے ان کا نام شبیر احمد خان رکھا۔ مگر جوش نے آگے چل کر اس نام کو تبدیل کر کے شبیر حسن خاں رکھ لیا۔ یہ تقریباً 1907 کا زمانہ تھا۔ پھر جوش تخلص اختیار کیا۔ نسل کے اعتبار سے وہ آفریدی پٹھان تھے ان کے جد امجد اٹھارھویں صدی میں کابل سے منسلک خیبر کے علاقے سے ہندوستان آئے اور یہاں صفدر جنگ نے اپنی فوج میں ایک معزز عہدہ عطا کیا، تلوار کی دھار پر عزت وثروت حاصل کی ان کا نام یار بیگ خاں تھا ان کے دو بیٹے محمد عوض خاں اور چھوٹے بیٹے فقیر محمد خاں گویاؔ جو جوش کے پردادا تھے وہ نواب ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف بھی تھے ان سب کے باوجود اچھے علم دوست و ادب نواز بھی تھے۔ وہ لکھنؤ کے مشہور شاعر امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'دیوان گویا' کے نام سے مشہور ہے۔ جوش کے دادا نواب احمد خاں بھی اپنے زمانے کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ ان کے والد نواب بشیر احمد خاں بھی شعر و ادب کے استاد تھے۔ جوش کا ایسے جاگیر دار گھرانے سے تعلق تھا جہاں دولت وثروت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی پرورش ایک

زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ بقول جوش ان کے گھر ہمیشہ کوئی نہ کوئی ادیب یا شاعر مہمان رہا کرتا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے خاندان میں ان کے پردادا سے ہی شعر گوئی کی روایت قائم تھی جسے جوش نے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے ایک اہم مقام تک پہنچایا۔

دستور کے مطابق جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اپنے اساتذہ سے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ نیز دیوانِ حافظ وغیرہ کا درس لیا۔ جوش نے اُردو کی تعلیم مولوی طاہر علی صاحب سے، عربی مولوی قدرت اللہ بیگ سے، فارسی مولوی نیاز علی سے اور انگریزی ماسٹر گومتی پرساد سے سیکھی۔ یہ سبھی اساتذہ اس زمانے کے اودھ کے نامور اساتذہ تھے۔ ان کی مزید تعلیم سیتاپور، لکھنؤ ایم.اے.او کالج علی گڑھ اور سینٹ پیٹرس کالج آگرہ سے ہوئی۔ کالج کی پڑھائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ان کے والد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جوش تعلیم بیچ میں ترک کر کے ملیح آباد واپس چلے آئے اور آبائی ریاست کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی زندگی میں ایک طوفان سا آ گیا۔ دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں نے نگاہیں پھیر لیں۔ زندگی سنسان و ویران نظر آنے لگی۔

شادی بھی ان کے والد نے اپنے انتقال سے قبل چچازاد بھائی کی بیٹی اشرف جہاں سے کر دی تھی۔ خانگی مسائل نے جوش کو آ گھیرا۔ ادھر جوش حافظ، ٹیگور اور خیام سے متاثر ہو رہے تھے، انھیں ان سب حالات نے دنیا کی بے ثباتی کا احساس بھی دلا دیا تھا۔ اسی لیے ان کے پہلے مجموعے 'روحِ ادب' کی پہلی نظم 'ترانۂ بیگانگی' اس کیفیت کی ترجمان ہے۔

جوش ملیح آبادی کی زندگی میں بڑی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب 1924 میں انھوں نے ذریعۂ آمدنی کی فکر میں حیدرآباد کا سفر کیا۔ وہاں ان کا تقرر دارالترجمہ میں ناظر ادب کے عہدے پر ہوا۔ اسی زمانے میں جوش نے حیات بیکن اور شیکسپیئر کا ترجمہ کیا۔ حیدرآباد کی زندگی جوش نے کبھی فراموش نہیں کی۔ 1934 میں بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر حیدرآباد سے دہلی چلے آئے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف کام کیے مثلاً 1935 میں دہلی سے ایک ماہ نامہ 'کلیم' جاری کیا جو عوام و خواص دونوں میں بہت مقبول ہوا۔ رسالے کے ذریعے جوش نے نثر نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا۔ چار سال پابندی سے نکلنے کے بعد مالی مشکلات کے سبب 'کلیم' ماہ نامہ 'نیا ادب' میں ضم ہو گیا، جوش اس کے مدیر مقرر ہوئے اور 1941 تک اس کی ادارت کرتے رہے۔ ماہنامہ 'کلیم' میں شائع شدہ مضامین 1942 میں 'اشارات' کے نام سے منظر عام پر آئے۔ اسی دور میں ان کے مختلف شعری

مجموعے مثلاً نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون حکمت، حرف و حکایت اور آیات و نغمات وغیرہ شائع ہوئے۔ اس کے بعد جوش کچھ عرصہ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ پونا کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت کر لی اور اس سلسلے میں کئی سال تک ممبئی میں مقیم رہے۔ ان کے فلمی گیت کافی مقبول ہوئے۔ ملک کو آزادی ملنے کے بعد انھوں نے محکمہ اطلاعات و نشریات کے ماہنامہ 'آجکل' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ 1948 سے 1955 تک انھوں نے اس رسالے کی کامیاب ادارت کی۔ جس کی وجہ سے جوش کی شہرت میں کافی اضافہ ہوا۔

جوش ملیح آبادی کو کئی القاب عطا کیے گئے کبھی شاعرِ انقلاب تو کبھی شاعر اعظم کے القاب سے نوازہ گیا۔ بعد میں شاعرِ فطرت، شاعرِ شباب، مصورِ فطرت اور شاعرِ رومان وغیرہ بھی کہا جانے لگا۔ جوش نے اُردو زبان اور ہندوستان کو اپنی شاعری کے ذریعے بیش بہا جواہر عطا کیے۔ ان کی انھیں گراں قدر خدمات کی بنا پر حکومت ہند نے 1955 میں پدم بھوشن سے نوازا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اچانک جوش نے اپنے سفر کی باگ پاکستان کی طرف موڑ دی یعنی وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ہجرت سے قبل ان کے کچھ اور شعری مجموعے 'عرش و فرش'، 'راش و رنگ'، 'سنبل و سلاسل'، 'سیف و سبو'، 'سرود و خروش'، 'سموم و صبا' اور 'طلوعِ فکر منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ جوش کو پاکستان میں بڑی دشواریوں سے گزرنا پڑا۔ ایک طرف فکرِ معاش تھی دوسری طرف ادبی گروہ بندیاں، ترقی اُردو بورڈ کراچی میں اُردو لغت سازی کے کام سے بحیثیت مدیر وابستہ ہو گئے۔ رسالہ 'اُردو نامہ' کی بھی ادارتی ذمے داریاں نبھاتے رہے۔ ہجرت کے بعد شعری مجموعے 'الہام و افکار'، 'نجوم و جواہر' اور مشہور خود نوشت 'یادوں کی برات' شائع ہوئی۔ 22 فروری 1982 کو اسلام آباد میں جوش اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی موت پر ہندو پاک میں صف ماتم بچھ گیا۔ بلاشبہہ جوش اردو شاعری کی آبرو ہیں ان کا فن زندہ اور ان کی شعری اقدار مسلّم ہیں وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

12.3.1 جوش ملیح آبادی کی نظم نگاری

جدید اردو شاعری میں جوش ایک اہم اور معتبر نام ہے شاعرِ شباب اور شاعرِ فطرت ہونے ساتھ ساتھ ان کی شناخت ایک انقلابی شاعر کے طور پر بھی ہوتی ہے۔ وہ جنگ آزادی کے مجاہد بھی مانے جاتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ مجاہد آزادی کے شانہ بہ شانہ لڑے ہوں۔ گویا جوش ملیح آبادی اپنی شاعری سے ہندوستان کے لاکھوں دلوں میں انگریزوں کے خلاف بیداری کی ایک لہر پیدا کر رہے

تھے جو اس وقت کا ایک اہم تقاضہ تھا جسے قومی ذمہ داری سمجھ کر انھوں نے بخوبی نبھایا۔ بعض دشوار اہم اور قطعی نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ وہ انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں کو بھی اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان کی ذاتی زندگی اور اس دور کی اجتماعی زندگی دونوں ہم آہنگ ہیں۔ جوش کا اپنا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں جمالی اور جلالی دونوں کیفیتیں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلوں، رُباعیوں اور غیر سیاسی نظموں کا لہجہ بالکل الگ ہے۔ ان میں دھیما پن اور طنزیہ انداز نمایاں ہے۔ مگر وہیں سیاسی نظموں میں طبیعت کی تیزی، بلند آہنگی اور باغیانہ خیلات کی گونج سنائی دیتی ہے۔

جوش کی نظموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں تضاد کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ انہوں نے زندگی یا کائنات کے صرف متضاد پہلوؤں پر ہی نظر نہیں رکھی بلکہ متضاد نظر آنے والے پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بھی دیکھا ہے۔ ان کی نظر میں زندگی اور کائنات کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے تضاد نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے کی تشکیل و تکمیل کرتے ہیں۔ اور یہی تضاد ان کی شخصیت میں بھی پایا جاتا ہے۔ جوش کو اپنی شخصیت کے تضاد کا احساس ہے ان کا اپنا قول ہے کہ میرے سینے میں دو دل ہیں اور وہ دونوں دل مختلف طریقے سے دھڑکتے ہیں اس لیے نظریات میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔

ملک میں انگریزوں کی ظالمانہ حکومت اور سیاست نے ان کے خون میں اُبال پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جس طرح محنت کش انسانوں کا استحصال کیا یہاں تک کہ معیشت کو تباہ و برباد کیا۔ غریبوں، کمزوروں، کسانوں اور مزدوروں پر ظلم و زیادتی کی وہ جوش کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ اس بنا پر جوش کی سیاسی نظموں میں جذبہ بغاوت اور آزادی کی تڑپ کی لہریں بار بار سر اٹھاتی ہیں۔

جوش وطن کی سالمیت کے لیے ہندو مسلم ایکتا اور اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے 1947 کے پس منظر میں جو ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے رکھ رکھاؤ کو نقصان پہنچا وہ ایک بڑا خسارہ ہے۔ جوش نے 1947 کے فسادات سے متاثر ہو کر ایک نظم ''ہندو مسلم کا متحدہ نعرہ'' مسدس کی شکل میں پیش کی اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو

بوجہل کی شراب سے چھلکا کے جام کو　　بٹّہ لگا دیا ہے محمد کے نام کو
بخشا ہے تاج راونِ دوزخ مقام کو　　ذلت کی گھاٹیوں میں اتارا ہے رام کو
حق کا جگر ہے خون تو دل چاک چاک ہے
قرآن پر ہے دھول تو گیتا پہ خاک ہے

گویا اس فساد نے ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان حیوانیت اور جنون کا جو ثبوت دیا وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔اس منظر کو جوش نے بہت ہی چابک دستی اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔

عورتوں کی تعلیم و ترقی کے سلسلے میں جوش کا نظریہ رجعت پسندانہ نہیں بلکہ ترقی پسندانہ ہے۔وہ معاشرہ میں خواتین کی آزادانہ کارکردگی کے قائل نہیں ہیں لیکن اتنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کا قدرتی حسن برقرار رہے۔انھیں ایسی محنت ومشقت اور علمی کاموں کی کثرت پسند نہیں جس کی وجہ سے نسوانی حسن ماند پڑ جائے۔وہ پردے کی پابندیوں قید و بند اور بزرگوں کے بے جا رعب کو عورت کے لیے پسند نہیں کرتے۔

جوش ملیح آبادی کا سماجی شعور بہت بلند و بالا تھا وہ قومی مدار پر نظام حیات کو ایک خاص محور پر لانا چاہتے تھے۔بزدلی اور سستی کی جگہ وہ بیداری اور خودداری کو اہمیت دیتے تھے۔ان کے یہاں صرف البیلی صبح اور نعرہ شباب ہی نہیں بلکہ کسانوں کی بیداری کا پیغام بھی ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ شکست زنداں کا خواب بھی ہے،ترانہ آزادی بھی ہے اور شہدائے آزادی کی یاد بھی اور بھوکے ہندوستان کا بھی ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔

جوش نے سماجی،سیاسی اور فطرت کی زندگی اور مظاہرِ حسن پر جتنا لکھا ہے دوسرے کسی شاعر نے نہیں لکھا۔ان کے متعدد شعری مجموعے ہیں جن میں شامل نظمیں ان کے شعلۂ جذبات سے پُر ہیں جو نوجوانوں کو حرکت وعمل پر اُکساتی اور نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے قربانی پر آمادہ کرتی ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی شاعری کا ایک اہم پہلو منظر نگاری اور فطرت کے بے بہا خزانوں کی جستجو ہے۔ان کی فطرت پسندی محض چاند تاروں،صبح وشام یا دیگر مظاہر قدرت کے بیان تک محدود نہیں،بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ فطرت کو دیکھ کر متحیر ہیں اور حیرت واستعجاب کے اس عالم میں فطرت کے حسین ودلکش

نظارے ان کے مونس وغم خوار بن جاتے ہیں ''ترانہ بیگانگی'' کے عنوان سے روح ادب کی پہلی نظم جس میں جوش کچھ اس طرح کہتے ہیں:

چھوڑ کر انساں کو میں فطرت کا شیدا ہوگیا　　خوبیٔ قسمت کہ فوراً ربط پیدا ہوگیا
میرا ہمدم سبزہ زار و کوہ صحرا ہوگیا　　دوست میرا چشمۂ گلزار و دریا ہوگیا
مجھ کو حلقے میں تبسم نے لیا خورشید کے
شامِ غم رخصت ہوئی جلووں میں صبحِ عید کے
دوست یہ ایسے ہیں جو دھوکا نہیں دیتے کبھی　　جھوٹ سے واقف نہیں ہے ان رفیقوں میں کوئی
وقت آتا ہے تو کھل جاتی ہے ہنس کر چاندنی　　صبح ہوتی ہے چٹک جاتی ہیں کلیاں باغ کی
ان کے وعدے وقت پر ایفا نہ ہوں ممکن نہیں
کون سی وہ 'رات' ہے جس کے سرے پر 'دن' نہیں؟

جوش نے مناظرِ فطرت کو مختلف انداز میں شاعرانہ کمال کے ساتھ پیش کیا۔ قدرت کی رعنائیاں ان کے نزدیک کلامِ الٰہی کا درجہ رکھتی ہیں، وہ منظر نگاری کے لیے پوری کائنات پر نظر رکھتے ہیں اور 'جز' سے 'کل' کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ الفاظ کی مدد سے تخیلی پیکر تراشنا جوش کی فطرت میں داخل ہے۔ جوش نے اپنی نظموں میں تشبیہات اور تراکیب سے حسن پیدا کیا ہے۔ تشبیہ اور استعارے کو اس کی فضا اور موقع محل کے مناسب استعمال سے کلام میں تازگی اور ندرت پیدا ہوگئی ہے۔ جوش کی منظریہ شاعری کا پیمانہ جمالیاتی عناصر سے لبریز ہے۔ گویا ایک طرح سے فطرت اور رومان کا حسین امتزاج ان کی شاعری کا ایک خاص وصف ہے۔

بحیثیت مجموعی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بڑا فنکار کبھی بھی ملک اور نسل و مذہب کی سرحدوں میں قید نہیں رہ سکتا اس کا پیغام ساری دنیا کی انسانیت کے لیے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں اس کا اپنا تخیل اور روحانی وجود ہر رنگ سے توانائی اور شادابی حاصل کرتا ہے لیکن اس کی نگارشات میں ساری انسانیت اس کی مخاطب ہوتی ہے۔ جوش نے پوری فعالیت کے ساتھ اپنے اس منصب کو نبھایا ہے وہ اپنی تخلیقات میں آج بھی زندہ ہیں اور آگے بھی زندہ رہیں گے۔

12.3.2

ا- البیلی صبح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، اُفق کی لَو تھرتھرا رہی ہے
روِش روِش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی مُسکرا رہی ہے
ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے
طیور، بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جُھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدِّنظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلّو سُکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چُھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چُھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیو! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گُلشن کی نرم رو میں یہ کیسی آواز آ رہی ہے؟

تشریح

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں، اُفق کی لَو تھرتھرا رہی ہے

صبح کائنات ایک نئی نویلی دلہن کی طرح ہے۔ جو نظر جھکائے ہوئے اپنی پیشانی سے بالوں کو ہٹا رہی ہے۔ یہاں جبیں سے مراد سورج ہے، اور زلفیں کو رات یا اندھیروں کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ رات کا اندھیرا غائب ہو رہا ہے، سورج دھیرے دھیرے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کی روشنی میں صبح کاذب کا تارا ڈوب رہا ہے۔ اُفُق سے مراد دلہن کے ہونٹ ہیں جو آسمان اور زمین کے مانند ملے ہوئے ہیں جس پر کپکپی طاری ہے، 'سحر کا تارا' نئی نویلی دلہن کا چہرہ ہے جس پر جذبات کا زلزلہ یعنی (خوشی، ندامت، حیرت اور شرم) کے کئی رنگ ایک ساتھ نمودار ہونے سے بھوچال آیا ہوا ہے۔

روش روش نغمۂ طرب ہے، چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی مسکرا رہی ہے

صبح کے وقت شاعر نے باغ میں دیکھا کہ ہر طرف خوشی کے گیت گائے جا رہے ہیں اور چمن چمن میں رونق و بہار آئی ہوئی ہے۔ پرندے درختوں کی ڈالیوں پر بیٹھ کر چہچہا رہے ہیں اور پھولوں کی کلیاں خوشی سے گنگنا رہی ہیں۔ یعنی دو مختلف مناظر کی مرقع کشی کی گئی ہے ایک یہ کہ پرندے بیدار ہو کر شاخوں پہ چہچہا رہے ہیں۔ دوسرے ہر طرف کلیوں کے چٹکنے اور گنگنانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

اس شعر میں شاعر نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے کہ رات بھر جاگنے کے بعد ستاروں کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اور ان آنکھوں میں وہی کہانی ہے جو نئی نویلی دلہن کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ گویا چاند کی خوبصورتی اور نشیلی نگاہیں جادو جگا رہی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح عاشق کو معشوق کی نظروں میں دیکھائی دیتا ہے۔

طیور، بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیم فردوس کی سہیلی، گلوں کو جھولا جُھلا رہی ہے

اس شعر میں شاعر صبح کی ٹھنڈی، ہلکی اور خوش گوار ہواؤں کو فردوس کی سہیلی بتا رہا ہے۔ جو باغ سے ملنے آتی ہے اور پھولوں کو جھولا جھلاتی ہے۔ بھور کی محفل کے پرندے درختوں کی لچکتی ہوئی شاخوں پر بیٹھ کر ایسی آوازیں نکال رہے ہیں جو دلوں کو خوش کر دیتی ہے۔

کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں، یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

سردی کے موسم میں صبح سویرے شاعر کی نظر بیلے کی ایک کلی پر پڑتی ہے۔ جس پر شبنم کے قطرے چمک رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی پری ناک میں ہیرے کی کیل پہنے مسکرا رہی ہے۔ یہاں شاعر نے شبنم کو ہیرے کی کیل سے اور بیلے کی کلی کو پری سے تشبیہ دی ہے یعنی جمالیاتی پیکروں کی مدد سے پرکشش بنانے کی کوشش کی ہے۔

سحر کو مدِّنظر ہیں کتنی رعایتیں چشم خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے

چشم خوں فشاں سے مراد یہاں صبح کی لالی ہے، سحر جس کی منتظر رہتی ہے جب اس کا عکس صحرا پر پڑتا ہے تو پورا بیاباں سرخ ہو جاتا ہے اور آنے والی ہوا صبح کے وقت آسمان کی سرخی کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔

شلوکا پہنے ہوئے گلابی، ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے

یہاں شاعر کہتا ہے کہ باغ میں تمام نرم و نازک پنکھڑیاں گلابی رنگ کا شلوکا پہنے ہوئی ہیں اور اس پر لال رنگ سے رنگی ہوئی اوڑھنی کا کنارا ہوا میں سکھا رہی ہیں۔ صبح سویرے باغ کا ایک دلکش منظر ہے جسے شاعر نے بخوبی پیش کیا ہے۔

فلک پہ اس طرح چُھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی، جبیں سے افشاں چُھڑا رہی ہے

اس شعر میں شاعر سحر کے اس منظر کو پیش کرتا ہے جب آسمان کے ستارے چاند کے قریب آجاتے

ہیں۔صبح کا یہ منظر دیکھ کر شاعر کا گمان اس نئی نویلی دلہن کی طرف جاتا ہے جو اپنی پیشانی پر لگے ہوئے سونے اور چاندی کے باریک کترن (جو زیبائش کے لیے لگاتے ہیں) کو ہٹا رہی ہوتی ہے اور وہ اس کے چہرے کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر؟ چٹکتی کلیوں! ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کیسی آواز آ رہی ہے؟

باغ میں آہستہ آہستہ ہوا چل رہی ہے، کلیوں کی چٹکنے کی صدا کے ساتھ شاعر کو ایک اور آواز سنائی دیتی ہے۔ جسے سن کر اس کے دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس کی آواز ہے؟ اور ہو نہ ہو یہ آواز ان کے کسی محبوب ہی کی ہو سکتی ہے۔اس طرح یہ صبح شاعر کے لیے البیلی صبح ہو جاتی ہے۔

II کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دُور دریا کے کنارے دُھندلے دُھندلے سے چراغ
زیرِ لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بُجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی سورج کے چُھپ جانے سے تنگ
سبزہ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی، اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خُنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہُوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان

بام گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان
دُوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سُرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بُھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہُوا سا آسماں
پتّیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں اور اک قوی انسان؛ یعنی کاشت کار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدار خاک، امیرِ بوستاں
ماہر آئین قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظر گل، پاسبان رنگ و بو، گلشن پناہ
ناز پرور، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتح امّید و بیم
محرمِ اسرارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علم
محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہر عالم تاب کا نور نگاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نِظام

مُنکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیّار کرتا ہے شراب
اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
قلب آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خُو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کُلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیل رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو، جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ و گُل بن کے اِتراتی ہے خاک
ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے، جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے، پئے عزّ و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابشِ کلاہِ تاجدار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بُوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے بھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی نزاکت پر صلابت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ، گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر، پر بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیلِ بزم آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی، راز فطرت کا سُراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو، صبح درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مُضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چمکاتا ہوا
جس کے چُھو جانے سے مثلِ نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو اُلٹ دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امّید کی
جس کا مس خاشاک میں بُنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اُگلتی ہے زمین
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جِن میں آ جاتی ہے تیزی، کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو، جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ، حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے، کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا؟
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا
سِیم و زر، نان و نمک، آب و غِذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اِک خاموش ماتم کے سوا، کچھ بھی نہیں

ایک دل، اور یہ ہُجومِ سوگواری، ہائے ہائے!
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری، ہائے ہائے!

تیری نظروں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات؟
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی؟
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیٔ امن و اماں!
گُرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
اِدّعائے پیرویِ دین و اِیماں، اور تُو
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو
ہاں، سنبھل جا اب، کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

تشریح

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دُور دریا کے کنارے دُھندلے دُھندلے سے چراغ
زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بُجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی سورج کے چُھپ جانے سے تنگ
سبزہ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی، اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خُنکی سے گویا دن کی گرمی کا گِلا

جوش ملیح آبادی کی شناخت اردو شاعری میں ایک نباض فطرت کی بھی ہے اپنی نظم کسان کے آغاز میں انھوں نے شام کے وقت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کہتے ہیں کہ آفتاب غروب ہونے کے وقت وہ دریا کا دھیرے دھیرے بہنا اور آسمان میں شفق کا بکھرنا، شام کے وقت وہ دن کی تھکن سے فراغت نصیب ہونا اور وہ دریا کے کنارے دھندلے دھندلے چراغ کا ٹمٹمانا، ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ آسمان و زمین کے درمیان ہونے والی گفتگو اور غروبِ آفتاب سے ہونے والا اندھیرا اور میدان کی وسعتوں کا سمٹ جانا اور سبزہ کا افسردہ ہو جانا اور ساتھ ہی ایک سناٹے کی صدا بلند ہونا گویا دن کی گرمی کا گلہ کر رہی ہو یہ سب مناظر ایک منفرد انداز سے ہم سے روبرو ہوتے ہیں۔

اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہُوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بام گردوں پر کسی کے روٹھ کے جانے کی شان
دُوب کی خوشبو میں، شبنم کی نمی سے اک سُرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دُھواں
بُھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں
پتّیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی

جوش ملیح آبادی ہمارے معاشرے کے کم اہم سمجھے جانے والے اور گمنام کردار کو خراج تحسین پیش کر کے اسے وہ مقام دلانا چاہتے ہیں جس کا وہ حقدار ہے۔ کسان ملکی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ محنت و مشقت اور لگن کے ساتھ فصلوں کی نگہداشت کرتا ہے۔ کسان ہمیشہ

پھولوں، پھلوں اور باغوں کی حفاظت کرتا ہے ہر طرف لہراتا سبزہ پھولوں کی مہک اور رنگینی، کس کی بدولت ہے۔اور وہ اندھیروں میں کھیتوں کے بیچ کا راستہ طے کرتا ہوا چلا جاتا ہے اس وقت کا منظر گویا کسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نرم جان پودوں کو نیند آئی ہوئی ہے۔

یہ سماں، اور اک قوی انسان، یعنی کاشت کار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدار خاک، امیرِ بوستاں
ماہر آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظر گل، پاسبان رنگ و بو، گلشن پناہ
ناز پرور، لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارث اسرارِ فطرت، فاتح امّید و بیم
محرمِ اسرار باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علم
محنتِ پیہم کا پیماں، سخت کوشی کی قسم

جوش فرماتے ہیں کہ یہ خوبصورت سماں اور ان کے درمیان میں ایک قوی انسان یعنی کہ کسان جو ہماری ترقی کا پیشوا ہے تہذیب وتمدن کا رکھوالا ہے، طفل باراں ہے سلطنت کا امیر ہے قدرت کے قوانین کا ماہر ہے دنیا کے نظم ونسق کو سنبھالنے والا ہے گلوں پر نظر رکھنے والا ہے خوشبوؤں کا پاسبان ہے گلشن کو پناہ بخشنے والا ہے لہلہاتے کھیتیوں کی ناز برداری کرنے والا ہے فطرت کے راز کو سمجھنے والا ہے مایوسی میں امید کی کرن نکالنے والا ہے بارش کے بھید کو سمجھنے والا ہے ہواؤں کی طبیعت سے واقفیت رکھنے والا ہے صبح کا ہر دل عزیز فرزند ہے خورشید جو زر افشانی کرتا ہے اس کا علم بلند کرنے والا ہے مسلسل محنت ومشقت کا پیماں ہے سخت کوشی کے تمام مراحل اسی کسان میں مضمر ہیں۔

جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہر عالم تاب کا نور نگاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نِظام
مُنکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیّار کرتا ہے شراب
اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

جوش نظم کے اس حصے میں کہہ رہے ہیں کہ کسان خدا کی قدرت اور اس کے حسن کا شاہد ہے مہتاب کا دل ہے اور آفتاب کا نور نگاہ ہے اس کے قلب پر ظلمت و نور کا نظام عیاں ہوتا ہے۔ کسان اپنی عقل رسا سے صبح و شام کے مزاج کو بخوبی سمجھتا ہے۔ اس کی جوانی کے لہو سے بہار روزگار قائم و دائم ہے۔ فراغت کے وقت لبوں پر جو تبسم بکھرتا ہے اس کا مدار کسان کے آنسوؤں پر ہے اس کی جی توڑ محنت کا عرق شراب تیار کرتا ہے اس کے رخ کا رنگ تو اڑ جاتا ہے مگر وہ گلابوں کو جاودانی بخشتا ہے۔

قلب آہنِ جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خُو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کُلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیل رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو، جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ تاک
جس کے دم سے لالہ و گُل بن کے اِتراتی ہے خاک

اس حصے میں جوش کہتے ہیں کہ کسان کے نقش پا سے لوہا بھی پگھل جاتا ہے وہ گرم جھونکوں کا دوست ہے تیز کرنوں کا رفیق ہے بجلیوں کی انجمن کو اس کے خون سے جلا ملتی ہے اس کے سر پر آفتاب روشن ہوتا ہے رگ خاشاک میں اس کا لہو گردش کرتا ہے اس کے دل کی آنچ رنگ و بو میں حرکت پیدا کرتی

ہے رات کو اس کی نگاہیں آسمان پر لگی رہتی ہیں اور دن میں اس کی انگلیاں نبضِ خاک دیکھتی ہیں جس کی جان فشانی سے زمین امرت ٹپکاتی ہے جس کے دم سے زمین لالہ وگل بن کے اتراتی ہے۔

ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے، جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے، پئے عزّ و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابشِ کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بُوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

یہاں شاعر کہتا ہے کہ کسان کی آہ، دولت والوں کے لیے نشاط کا سبب بنتی ہے کسان سے بادشاہ کا چہرہ بھی تابانی کی بھیک مانگتا ہے۔ نبض صبر وتحمل میں اس کا خون دوڑتا ہے اور وہی خون شہزادیوں کی چال میں لوچ بھر دیتا ہے جس کے ماتھے کے پسینے کی چمک سے تاجدار وقت کا تاج بھی تابانی کی بھیک مانگتا ہے دنیا کی تمام تخریبی قوتیں کسان کے آگے سرنگوں رہتی ہیں جس کے دم خم کی وجہ سے تہذیب کی کمر لچکتی ہے۔

جس کی محنت سے بھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی نزاکت پر صلابت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ، گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر، پر بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

جوش کہتے ہیں کہ کسان کی محنت سے ہی ہمارے جسم میں تب وتاب باقی ہے ظلم و جبر کو برداشت کرنے والی اسکی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ جلتا ہے اس کے بازوؤں میں وہ مضبوطی اور بل ہے جس پر شہر یار اکڑتا ہے دھوپ سے جھلسے ہوئے کسان کے رخ پر مشقت کے نشاں نمایاں ہو رہے ہیں کھیت سے منھ پھیر کر اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہے اس کے سر پر ٹوکرا بغل میں پھاوڑا اور تیوری پر بل ہے اس کے سامنے بیلوں کی مضبوط جوڑی ہے اور کندھے پر مضبوط ہل ہے۔

کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیلِ بزم آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی، راز فطرت کا سُراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو، صبح درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مُضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چمکاتا ہوا
جس کے چُھو جانے سے مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

جوش سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ کون ہے جو ظلمت کو ختم کرنے والا ہے بزم آب وگل کی قندیل کو روشن کرنے والا ہے جو گلشن کی سلطنت کا دریچہ کھولتا ہے جو سینۂ گیتی کا دل ہے جو خوبصورت شہروں کا بانی ہے، فطرت کا پتہ دینے والا ہے جو تیغ جوہر دار کی خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کی دھار پر چمن میں کھلنے والے شگوفوں کا نظام ہے جو شام کو درخشندہ صبح کا پیام دیتا ہے جو مٹی میں روح دوڑاتا ہے جو زمیں کے ذروں کی موسیقیت میں چار چاند لگاتا ہے جس کے چھو جانے کے سبب مثل نازک اندام

مہ جبیں کی صورت لیلائے زمیں کروٹیں لیتی ہے۔

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو الٹ دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امّید کی
جس کا مس خاشاک میں بُنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اُگلتی ہے زمین
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جن میں آ جاتی ہے تیزی، کھیتیوں کو روند کر

جوش کہتے ہیں کہ ہل کے چلنے سے زمین کے اندر کے سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں خاک مسکراتے ہوئے اپنی چادر کو الٹ دیتی ہے جس کی چمک میں عید کے چاند جیسی روشنی نمایاں ہے جو خاک کے مایوس کن مطلع پر امید کی کرن بکھیرتا ہے اور دہقاں سر کو جھکائے ہوئے اپنے گھر کی جانب رواں دواں ہے اور وہ ان سیاسی رتھ کے پہیوں پر نظر جمائے ہوئے ہے جن میں کھیتیوں کو روند کر تیزی آ جاتی ہے۔

اپنی دولت کو، جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حِرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے، کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا؟
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا

سِیم و زر، نان و نمک، آب و غِذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اِک خاموش ماتم کے سوا، کچھ بھی نہیں

جوش کہتے ہیں کہ کسان اپنے جگر پر تیر کھاتے ہوئے اپنی دولت کو دشمن ملک کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے اس کی راہ کبھی حرماں نصیبی سے کٹتی ہی نہیں اس کی نگاہیں اپنے فاقہ کش بچوں کے بجھے ہوئے آنسوؤں پر لگی ہوئی ہے اس کی آنکھوں کے نیچے بار بار وہ خوں چکاں منظر پھر رہا ہے جو گھر کی ناامید دیوی اور اس کے غم ناک شباب کی شکل میں پنہاں ہے وہ یہ سوچتے ہوئے جا رہا ہے کہ کن آنکھوں سے اپنی بیوی کا بے ردا سر اور بچوں کا اترا ہوا منھ دیکھے گا۔ جوش کہتے ہیں کہ سماج میں اتنا کلیدی رول ادا کرنے والے کسان کے گھر میں نہ مال و دولت ہے نہ نان و نمک ہے اور نہ ہی دانہ پانی ہے۔ سوائے ایک خاموش ماتم کے کچھ بھی تو اس کے یہاں موجود نہیں ہے۔

ایک دل، اور یہ، ہجومِ سوگواری، ہائے ہائے!
یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری، ہائے ہائے!
تیری نظروں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات؟
ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی؟
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیٔ امن و اماں!
گُرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
اِدّعائے پیرویِ دین و اِیماں، اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہُو
ہاں، سنبھل جا اب، کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

جوش نظم کے آخری حصے میں سرمایہ داری کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان کا ایک تنہا دل اور اس پر غموں کا اتنا ہجوم افسوس کہ یہ سارے غموں کی ذمہ دار یہ سنگ دل سرمایہ داری ہے، کہتے ہیں کہ سرمایا داری تیری نظروں میں سنگ دلی کے وہ شرارے تیر رہے ہیں جن کے آگے چنگیزی خنجر کی دھار بھی مڑ جاتی ہے۔اے سرمایہ داری تیرے ہاتھ بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کیا تو ساری کائنات کو چبانا چاہتی ہے۔ظلم اور اتنا ظلم آخر اس طوفان کی کوئی حد بھی ہے تیرے جبڑوں میں غریب انسانوں کی بوٹیاں ہیں۔اے امن وامان کے حامی تیرے ستم دیکھ کر بھیڑیے بھی دانتوں تلے انگلی دباتے ہیں،تو دین وایماں کی پیروی کی دہائی دینے والے ظالم حکمراں ذرا دیکھ تو سہی تیری کہنیوں سے مظلوموں کا لہو ٹپکتا ہے ہاں اب تیری بھلائی اسی میں ہے کہ تو اب سنبھل جا کیوں کہ عوام الناس کے دل تیرے لیے بغاوت سے بھرے ہوئے ہیں اور نہ جانے کتنے طوفاں تیری کشتی کو غرق کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔

12.4 آپ نے کیا سیکھا

- جوش ملیح آبادی کے احوال وکوائف سے واقف ہوئے۔
- جوش نے معقول ذریعۂ آمدنی کی فکر میں حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔اور وہاں دارالترجمہ سے وابستہ ہوگئے۔بعد میں ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے ان تمام چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔
- جوش ملیح آبادی اردو شاعری میں خاص طور سے نظم نگاری میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔شباب اور انقلاب کے جذبوں کیعلم بردار ہیں انھیں مناظرِ فطرت اور نسائی حسن سے گہرا لگاؤ تھا، اس سے متعلق آپ نے جان کاری حاصل کی۔
- جوش ملیح آبادی کی شاعری سے واقف ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ شاعر فطرت کی حیثیت سے ان کی شناخت ہوئی۔
- جنگ آزادی میں جوش کی نظموں نے جو رول ادا کیا تھا اس سے واقف ہوئے۔اور جوش کو انگریزوں سے جو نفرت تھی اس سے بھی واقفیت ہوئی۔
- جوش کی نظموں میں مستعمل نئی لفظیات اور ان کے برتنے کے طریقۂ کار سے واقف ہوئے۔
- جوش کی دو نظموں کی تشریحات سامنے آئیں۔

12.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1. جوش کی تعلیم کے بارے میں مختصراً اظہار خیال کیجیے؟
2. جوش ملیح آبادی کے اسلوب کی خصوصیات بیان کیجیے؟
3. جوش کی چند تصانیف کے نام لکھیے؟
4. نظم ''البیلی صبح'' کے کسی دو شعر کی تشریح کیجیے؟
5. نظم ''کسان'' کا خلاصہ بیان کیجیے؟

12.6 سوالات کے جوابات

1. جوش نے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اپنے اساتذہ سے گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ نیز دیوانِ حافظ وغیرہ کا درس لیا۔ انھوں نے اُردو کی تعلیم مولوی طاہر علی سے، عربی مولوی قدرت اللہ بیگ سے، فارسی مولوی نیاز علی سے اور انگریزی ماسٹر گومتی پرساد سے سیکھی۔ یہ سبھی اساتذہ اس زمانے کے اودھ کے مانے ہوئے عالم تھے۔ ان کی مزید تعلیم سیتاپور، لکھنؤ ایم.اے.او کالج علی گڑھ اور سینٹ پیٹرس کالج آگرہ سے ہوئی۔ کالج کی پڑھائی ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ جوش تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملیح آباد واپس چلے آئے۔
2. جوش ملیح آبادی کے اسلوب میں مقفّیٰ اور مسجع عبارت کا ملمع چڑھا ہوا ہے اور اپنی عبارت میں بے دریغ پر تکلف الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، ساتھ میں تشبیہ و استعارے کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں۔ اُردو ادب میں چار ایسے شاعر و ادیب ہیں جن کے یہاں سرمایہ الفاظ کی فراوانی ہے نظیر، سودا، انیس اور جوش ملیح آبادی۔
3. روحِ ادب، شعلہ و شبنم، نقش و نگار، سنبل و سلاسل، فکر و نشاط اور یادوں کی برات وغیرہ۔
4.

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے

سحر کا تارا ہے زلزلے میں، اُفق کی لَو تھرتھرا رہی ہے

صبح کائنات ایک نئی نویلی دلہن کی طرح ہے۔ جو نظر جھکائے ہوئے اپنی پیشانی سے بالوں کو ہٹا رہی ہے۔ یہاں جبیں سے مراد سورج ہے، اور زلفیں کو رات یا اندھیروں کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ رات کا اندھیرا غائب ہو رہا ہے، سورج دھیرے دھیرے ظاہر ہو رہا

ہے۔اس کی روشنی میں صبح کاذب کا تارا ڈوب رہا ہے۔اُفُق سے مراد دلہن کے ہونٹ ہیں جو آسمان اور زمین کے مانند ملے ہوئے ہیں جس پر کپکپی طاری ہے، 'سحر کا تارا'، نئی نویلی دلہن کا چہرہ ہے جس پر جذبات کا زلزلہ یعنی (خوشی، ندامت، حیرت اور شرم) کے کئی رنگ ایک ساتھ نمودار ہونے سے بھوچال آیا ہوا ہے۔

5. جوش نے اپنی نظم کسان کے ابتدا میں مناظر فطرت کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔شام کے وقت کی منظر کشی قاری کے ذہن و دل کو مدہوش کر دیتی ہے۔جیسے شام کے وقت کی شفق اور اس کا اضطراب دریا کے کنارے ملتے ہوئے دھندلے دھندلے چراغ اور آسمان پر سورج کے غروب ہو جانے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ان سب کی حسین عکاسی جس عمدگی کے ساتھ کی گئی ہے وہ جوش کا خاصّہ ہے۔جوش نظم کے اس حصے میں فطرت کے اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جوش فطرت کے لیے اور فطرت جوش کے لیے ہے۔

نظم کے دوسرے دوسرے حصے میں جوش نے کسان کی عظمت کو بیان کیا ہے۔جوش کے نزدیک کسان ہمارے سماج میں ایک ایسا تارہ ہے۔جو تہذیب وتمدن کا پیشوا ہے۔وہ صبح و شام کے اسرار ورموز سے واقف ہے۔آفتاب ومہتاب اسے عزیز ہیں۔ہماری زندگی میں جو کیف وسرور ہے اس کی آبیاری کسان اپنے خون سے کرتے ہیں۔کسان کی محنت ومشقت سے سماج کو آب ودانا ملتا ہے۔وہ دن رات اپنے کھیتوں میں کام کرتا ہے۔جس کی وجہ سے زمین وآسمان میں ہونے والی ہلچل کو بخوبی سمجھتا ہے۔اس کی جی توڑ محنت سے زمین سونا اگلتی ہے۔

نظم کے تیسرے حصے میں جوش نے کسان کے مضبوط ہل کی اہمیت پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ جوش فطرت کے کتنے بڑے مداح ہیں۔ جوش کے نزدیک کسان کا ہل ظلم وجبر کا خاتمہ کرنے والا ہے۔کسان خاک کے ذرے ذرے میں جان ڈالنے والا ہے۔۔مگر اس کی محنت کا ثمرہ اسے نہیں ملتا۔اس کے بچے پھر بھی فاقہ کشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔جوش نظم کے آخری حصے میں اپنے مخصوص انداز میں سرمایہ داری کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے سرمایہ دار، ان سب کا ذمہ دار صرف اور صرف تو ہے۔ترے ہاتھ مظلوم ہیں اور بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں اب سنبھل جا تیری کشتی کو ڈبانے کے لیے بہت سے طوفان تیار ہو گئے ہیں۔جوش دوسرے شعراء کی طرح

مایوسی کے شکار نہیں اور نہ ناکامیوں کا رونا روتے ہیں بلکہ تہدیدی انداز میں کہتے ہیں کہ اے سرمایہ دار، اب سنبھل جا تیری کشتی کو ڈوبنے کے لیے بہت سے طوفان تیار ہو گئے ہیں۔

12.7 فرہنگ

فلک	آسمان
شلوکا	کہنیوں تک آستینوں کا کرتہ جو کمر تک ہوتا ہے
ہلال	چاند
افشاں	سونے چاندی کا برادہ
چشم خوں	سرخ آنکھ
سحر	صبح
اضطراب	بے چینی
فراغ	آرام
ارض	زمین
آفریں	شاباش
مخمور	نشہ میں چور
پیشوا	رہبر
مدار	گردش کی جگہ
خاشاک	کوڑا کرکٹ
رقیق	پتلا
صلابت	سختی
دریچہ	چھوٹا دروازہ
شقاوت	بدبختی، سنگدلی
گرگ	بھیڑیا

12.8 کتب برائے مطالعہ

1. یادوں کی برات — جوش ملیح آبادی — مشہور آفسیٹ پریس، کراچی، 1970
2. انتخاب کلیات جوش — عصمت اللہ آبادی — اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، 1987
3 جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن — ظفر محمود — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1989

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

Study Of Urdu Nazm

اردو نظم کا مطالعہ

BUDC-134

ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اسکول آف ہیومینیٹیز، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسیٹی، نئی دہلی

Study Of Urdu Nazm
BUDC-134